حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

اور

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ

کا باہمی ربط

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگا ہردوئی روڈ لکھنؤ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

کا باہمی ربط

انتخاب وترتیب

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشر

ادارہ افادات اشرفیہ دوبگّا ہردوئی روڈ لکھنؤ

تفصیلات

نام کتاب	:	حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور مفکر اسلام
	:	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا باہمی ربط
مرتب	:	محمد زید مظاہری ندوی
تعداد	:	۱۱۰۰
صفحات	:	۱۸۴
سن اشاعت	:	۱۴۲۹ھ ۲۰۰۸ء
قیمت	:	

ملنے کے پتے

☆ ندوی بکڈپو لکھنؤ ندوۃ العلماء لکھنؤ

☆ مکتبہ الفرقان نظیر آباد لکھنؤ

☆ نعیمیہ بکڈپو دیوبند، اور دیوبند وسہارنپور کے تمام کتب خانے

☆ مقامی مجلس دعوت الحق مدرسہ سیدنا عمر فاروقؓ گلّو شاہ تکیہ چوک لکھنؤ ۳

☆ مکتبہ ابوالحسن محلّہ مبارک شاہ سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

☆ مکتبہ رشیدیہ محلّہ مبارک شاہ سہارنپور ۲۴۷۰۰۱ (یوپی)

فہرست

باب ۱

باب ۲

باب ۳

باب ۴

باب ۵

باب ۶

باب ۷

باب ۸

دعائیہ کلمات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

فاضل عزیز مولوی محمد زید مظاہری ندوی مدرس جامعہ عربیہ ہتورا (بارک اللہ فی حیاتہ وفی افادتہ) نے جو حضرت حکیم الامت کے افادات وارشادات اور تحقیقات ونظریات کو مختلف عنوانوں اور موضوعات کے ماتحت اس طرح جمع کررہے ہیں کہ حضرت کے علوم وافادات کا ایک دائرہ المعارف انسائیکلوپیڈیا، تیار ہوتا جارہاہے......

ان خصوصیات اور افادیت کی بنا پر عزیز گرامی قدر مولوی محمد زید مظاہری ندوی نہ صرف تھانوی اور دیوبندی حلقہ کی طرف سے بلکہ تمام سلیم الطبع اور صحیح الفکر حق شناسوں اور قدردانوں کی طرف سے بھی شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں۔

اور اسی کے ساتھ اور اس سے کچھ زیادہ ہی داعی الی اللہ اور عالم ربانی مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی سرپرست جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی) اس سے زیادہ شکریہ اور دعاء کے مستحق ہیں جن کی سرپرستی اور نگرانی ہمت افزائی اور قدردانی کے سایہ میں ایسے مفید اور قابل قدر کام اور انکے زیر اہتمام دانش گاہ اور تربیت میں انجام پارہے ہیں۔

اطال اللہ بقائہ وعمم نفعہ جزاہ اللہ خیرا.

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلی

۱۷/ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ

دعائیہ کلمات

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحبؒ باندوی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

حکیم الامت حضرت مولانا مقتدانا الشاہ اشرف علی تھانویؒ کے بارے میں بزمانہ طالبعلمی اکابر امت نے اس کا اندازہ لگالیا تھا کہ آگے چل کر مسند ارشاد پر متمکن ہوکر مرجع خلائق ہوں گے اور ہر عام وخاص ان کے فیوض وبرکات سے متمتع ہوں گے۔ چنانچہ حضرت اقدس کے کارہائے نمایاں نے اساطین امت کے اس خیال کی تصدیق کی، کہنے والے نے سچ کہا ہے۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

خداوند قدوس نے حضرت والا کو تجدید اور احیاء سنت کے جس اعلیٰ مقام پر فائز فرمایا تھا اس کی اس دور میں نظیر نہیں۔

آج بھی مخلوق حضرت کی تصنیفات وارشادات عالیہ اور مواعظ حسنہ سے فیضیاب ہورہی ہے۔ حضرت کے علوم ومعارف کے سلسلہ میں مختلف عنوان سے ہندو پاک میں کام ہورہا ہے، لیکن بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اللہ پاک نے محض اپنے فضل سے عزیزی مولوی مفتی محمد زید سلمہ، مدرس جامعہ عربیہ ہتورا کو جس نرالے انداز سے کام کی توفیق عطا فرمائی اس جامعیت کے ساتھ ابھی تک کام نہیں ہوا تھا اس سلسلہ کی چار درجن سے زائد ان کی تصانیف ہیں۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ اس کو قبولیت تامہ عطا فرمائے اور مزید توفیق نصیب فرمائے۔

احقر صدیق احمد غفرلہ

خادم جامعہ عربیہ ہتورا باندہ (یوپی)

تقریظ

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی مدظلہ

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے گذشتہ عیسوی صدی میں تین چوتھائی سے زیادہ کی مدت گذاری وہ ایک ایسے گھرانے کے فرد تھے جہاں علم وفن دونوں کی فکر بڑے اہتمام کے ساتھ کی جاتی رہی ہے اور خود مولانا رحمہ اللہ کے نانا اپنے وقت کے بڑے بزرگوں اور مرشدوں میں رہے ہیں اور ان کے اصلاح وارشاد کے کام سے مشرقی یوپی سے وسط یوپی تک کے لوگ مستفید ہوئے ہیں۔ ان کی صاحبزادی نے جو مولانا کی والدہ تھیں اپنے والد سے بڑا فیض حاصل کیا تھا جس کا اثر مولانا کی تربیت میں بھی نمایاں ہوا، چنانچہ مولانا جب اپنی تعلیمی زندگی کے اختتام تک پہونچ رہے تھے انہوں نے اپنے وقت کے بزرگوں اور مرشدوں سے ملنے اور ان سے استفادہ کرنے کا سلسلہ شروع کردیا تھا، اور یہ استفادہ انہوں نے وسعت قلبی کے ساتھ اپنے عہد کے سب ہی بزرگوں سے کرنے کا اہتمام کیا، انہوں نے استرشاد کا خاص تعلق حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے شروع کیا اور ان کے مجاز بیعت وخلیفہ ہوئے، پھر حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری سے خصوصی ربط قائم کیا اور ان کے معتمد خاص اور خلیفہ ہوئے، اسی کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بھی تعلق رکھا اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بھی ربط وتعلق

قائم لیکن مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دیگر معاصر مرشدین کے مقابلہ میں زیادہ پہلے اس دنیا سے رحلت کرنے والے تھے اس لئے ان سے مولانا کے ربط وتعلق کی مدت کم رہی، اور وہ شروع زندگی میں رہی۔

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے جو ربط رہا وہ بھی خصوصی اہمیت کا حامل رہا اس کے تذکرہ سے بھی دینی رشد واصلاح کے طالبین کے لئے استفادہ کا اچھا موقع ہے جو اگرچہ استفادہ کی زمانی مدت کی کمی کی وجہ سے اس تعلق کے معاملات میں مقدار کی کمی رکھتی ہے لیکن پھر بھی خط وکتابت اور تعلق کے سلسلہ کے مختلف امور کا ایک قابل ذکر حصہ بنتا ہے، اس حصہ کو تلاش کرنے اور اکٹھا کر کے ایک پوری کتاب بنانے کا کام مولانا مفتی محمد زید مظاہری ندوی نے انجام دیا، یہ ان کے اس سلسلہ جمع وتالیف کا ایک جزء ہے جو وہ حضرت تھانویؒ کے افادات وتعلقات کے سلسلہ میں مختلف مجموعوں اور کتابوں کی صورت میں کرتے رہے ہیں ان کی یہ کوشش بھی قابل قدر ہے اور حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے حضرت مولانا تھانویؒ سے تعلق اور قدردانی کے سلسلہ میں جاننے کا شوق رکھنے والوں کے لئے علم واستفادہ کا ایک ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ مفتی زید صاحب کے اس عمل کو قبول فرمائے اور جزاء عطاء فرمائے۔ آمین

محمد رابع حسنی ندوی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مدحت ومنقبت منظوم

از: حضرت مولانا سید محمد ثانی صاحب حسنیؒ مدیر ''رضوان''، لکھنؤ

خدا نے اپنی قدرت سے کئے شمس وقمر پیدا
کئے لعل و گہر تھانہ بھون کی خاک پر پیدا

انہیں میں ایک تھا لعل بدخشاں لولو لالا
دعا ہے لعل ایسا ہو ہر اک مومن کے گھر پیدا

مبارک نام تھا اشرف علی اس مرد حق بیں کا
محبت دل میں ہو جاتی تھی جس کو دیکھ کر پیدا

متانت بھی سخاوت بھی، کمال وفضل وصورت بھی
خدا نے ہر صفت کی پاک سے پاکیزہ تر پیدا

ہوئی جسکے قدم سے دور ظلمت شرک وبدعت کی
کیا اللہ نے توحید و سنت کی سحر پیدا

تصوف کے گلستاں میں بہار بے خزاں لایا
ہر اک شاخ نشیمن پر کئے گلہائے تر پیدا

بکھیرے جس نے موتی معرفت کے اور حکمت کے
خس وخاشاک سے جس نے کئے لعل و گہر پیدا

نجانے کتنے لوگوں نے بدل دی زندگی اپنی
کیا جس کے مواعظ نے دلوں میں اثر پیدا

کیا سیراب جس نے تشنگانِ علم وعرفاں کو
ہوئے جس کی نظر سے بے شمار اہل نظر پیدا

جسے اپنے کرم سے رتبہ قرب و رضا بخشا
کیا ہم میں خدا نے ایک ایسا راہ بر پیدا

خدا کے ایسے بندوں کی محبت عین ایماں ہے
انہیں کے غم میں رونے کو ہوئی ہے چشم تر پیدا

زمانہ سر جھکا دیتا ہے جس کے پاک قدموں پر
نہیں ہوتا جہاں میں روز روز ایسا بشر پیدا

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مقدمہ

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب ندوی
معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين محمد، وعلى آله وصحبه أجمعين وبعد.

ندوۃ العلماء کے اکابر اور اسلاف کا ہر دور میں اپنے عہد کے ''اہل دل'' سے تعلق رہا ہے اور اسی تعلق کی بناء پر وہ علم ودانش اور قلب کے درمیان متوازن تعلق اور ربط کی کوشش کرتے رہے ہے، حضرت مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا عبدالحی حسنی کا تعلق حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے رہا اور ان دونوں کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی اجازت بیعت وارشاد حاصل رہی، جب کہ مولانا عبدالحی حسنی صاحب نے حضرت شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی وفات کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں مکہ مکرمہ خط لکھ کر بذریعہ تحریر بیعت کی تھی اور اسی پر وہ ان کے مجاز بھی ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ بھی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ان حضرات کے علاوہ ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں وسرپرستوں میں کئی کا تعلق حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے رہا، جن میں حضرت مولانا سید ظہور الاسلام فتحپوری، نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی اور نواب سید علی حسن خان سابق ناظم ندوۃ العلماء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور یہ شخصیتیں ایسی تھیں، جنہیں ندوۃ العلماء کی معیاری شخصیات قرار دیا جاتا ہے، ان میں بعض شخصیات کو علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کی آئیڈیل شخصیت قرار دیا ہے اور فرمایا

کہ ”میرے نزدیک دار العلوم ندوۃ العلماء کے لئے آئیڈیل چار شخصیتیں ہوسکتی ہیں، مولانا محمد علی مونگیری، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی اور نواب سید علی حسن کہ یہ سب علم ودین کے مختلف شعبوں پر حاوی تھے اور ان سے ملکر ایک جامعیت پیدا ہوتی ہے“[1]

یہ بات علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اسلاف کے تعلق سے کہی تھی، ورنہ یہ بات سب سے زیادہ خود انہی پر صادق آتی ہے، ان کے ساتھ مولانا عبد الباری ندوی، مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کو شامل کرلیا جائے تو ایک کامل جامعیت نظر آئیگی، یہ چاروں قلبِ دردمند، ذہنِ ارجمند اور زبانِ ہوش مند، تینوں کا مجموعہ تھے اور اپنی دینداری، صلاح، اپنی دینی و دنیوی اور علمی وادبی جامعیت میں بھی امتیازِ خاص کے مالک تھے اور ان چاروں نے اپنے اپنے وقت کی عظیم دینی وروحانی شخصیتوں سے اکتساب فیض کیا۔

مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کا تعلق شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا تعلق حضرت مولانا احمد علی لاہوری اور حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری سے اور سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی۔ جن کو اقبال نے علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد قرار دیا۔ کا تعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے تھا اور یہ تعلق بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علم وتحقیق کے چشمہ سے سیراب ہوکر علوم دینیہ اور تاریخ اور ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطے لگانے کے بعد قائم ہوا۔

مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا عبد الباری ندوی نے جو علم جدید اور فلسفہ پر ناقدانہ نظر رکھتے تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے اپنے قلب کے سکون کے لئے تعلق قائم کیا اور یہ عقلیت اور روحانیت کے جمع کرنے

---

[1] پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۳۶۔

کی اعلیٰ مثال ہے، جو ندوہ کے اکابر نے ہر دور میں قائم کی اور اپنے کو علم کے غرور سے دور رکھا۔ ان کا یہ عمل علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق تھا:

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی کے اس تعلق کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

''۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہوکر اور علوم دینیہ اور تاریخ وادبیات کے سمندر میں بار بار غوطے لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس اور ''قلب کی کسی اور چیز کی تلاش'' محسوس کرنے لگے تھے اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبال کے الفاظ میں خلوتوں میں (زبان حال) سے زیر لب اس طرح گویا ہوتے تھے کہ:

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ میرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

شائد علماء معاصرین کم سے کم ہندوستان کے فضلائے مدارس میں کسی ضمیر میں عقل وعشق، قدیم وجدید، مشرق ومغرب اور دین وادب یا دین وفلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا، جس طرح ندوہ کے اس فاضل، سیرت النبی کے اس مصنف، میدان سیاست اور بزم ادب کے اس محرم راز اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انہوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی، اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا، اس کی تاریخ بھی لکھی تھی، اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بیتاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین، تلامذہ اس کے ماننے کے

لئے تیار نہ تھے کہ سید صاحب میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رطب سے فیضیاب نہیں ہوئے تھے، ان کی کتابوں نے بالخصوص ''خطبات مدراس''، ''سیرت النبی'' کے مضامین اور ''سیرت عائشہ'' کے صفحات نے ہزراوں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمت عالی اور طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو علم وادب کی وادی کو کامیابی اور فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلی جیسا خضر طریق ملا تھا، احسان اور تزکیہ کی وادی کے لئے بھی ایک خضر راہ اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی، اس سلسلہ میں ان کی کہانی اور ان کے واردات قلبی حجۃ الاِ سلام امام غزالی کی کہانی اور واردات قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں، کہ ان کو بھی علم وشہرت کے بام عروج پر پہونچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کدوکاوش سراب نظر آنے لگی اور علم ویقین کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں نکلے اور سیراب وکامیاب واپس آئے۔

یہ خضر راہ ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی شکل میں مل گئے اور چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت وحلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انہوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں میں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد واستناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفۂ مجاز ہوئے''۔[1]

حکیم الامت کے انتقال پر سید صاحب نے ''معارف'' میں جو تعزیتی نوٹ لکھا اس سے ان کے تعلق اور تاثر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

''محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف ومرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا، بالآخر بیاسی سال تین ماہ دس روز جل کر ۱۵؍رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

---

[1] پرانے چراغ، حصہ اول، ص:۳۲-۳۴۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم امت، مجد دِطریقت، شیخ الکل، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مرض ضعف واسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب کو دس بجے نماز عشاء کے وقت اس دار فانی کو الوداع کہا اور اپنے لاکھوں مریدوں اور معتقدوں اور مستفیدوں کو غمگین اور مہجور چھوڑا، إنا لله وإنا إليه راجعون، اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا، جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتوی، مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی یادگار تھا اور جس کی ذات میں حضراتِ چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ وتصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر وتقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرفِ زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا"۔[1]

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی خود اپنے تعلق کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا اسم گرامی احترام وعقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا، ان کی کتاب "بہشتی زیور" کا گھر گھر چلن تھا اور ان خاندانوں میں

[1] یادرفتگاں، ص: ۲۴۵، از: علامہ سلیمان ندوی۔

جو بدعات ورسوم سے دور تھے، وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی، غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا، خاندان کے ان بزرگوں اور اہل علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتوی سمجھتا تھا، ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا، مولانا سید حسین صاحب مدنی خاندان کے اکثر بزرگوں کے شیخ ومرشد تھے اور خود بھائی صاحب انہی سے بیعت اور ان کی محبت وعقیدت سے سرشار تھے، سیاسی خیالات میں بھی خاندان وماحول کا رجحان مولانا ہی کے مسلک کی طرف تھا، لیکن اس سے مولانا تھانوی کی عظمت وعقیدت میں کچھ فرق نہیں آیا، مولانا تھانوی کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ان سے مراسم وتعلقات تھے، ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری اور مولانا عبد الغنی صاحب پھول پوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، والد ماجد کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب تھلواروی جن کو ہم سب لوگ ''صوفی صاحب'' کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے، مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انہوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شائد چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا، وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے، مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا اور اس عقیدت واحترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے۔

میرا علمی وذہنی نشو ونما اس زمانہ میں ہوا کہ مولانا تھانوی نے سفر کا سلسلہ بالکل موقوف فرما دیا تھا، اس لئے اگست ۱۹۳۸ء سے پیشتر جب عرصۂ دراز کے بعد بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور پورا چلہ یہاں قیام فرمایا زیارت وملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی تھی، البتہ مکاتبت کا شرف اس سے کئی سال پیش تر حاصل ہو چکا تھا، ۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا، کہ بھائی صاحب نے جو میری

اخلاقی و دینی تربیت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کر کے واپس ہوں"۔[1]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تھانہ بھون حاضری اور حکیم الامت کا خاص اہتمام اور توجہ اور الطاف کا ذکر اپنے اسی مضمون میں کیا ہے، اس سے حکیم الامت کا حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے تعلق اور محبت کا اظہار ہوتا ہے، مولانا نے لکھا ہے کہ ملاقات کے وقت ان کی تصنیف سیرت سید احمد شہید سامنے نمایاں جگہ رکھی تھی۔

یہ واقعہ بھی خاندان کے بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ حضرت تھانوی ایک سفر میں رائے بریلی اسٹیشن سے گزر رہے تھے تو فرمایا کہ تکیہ شاہ علم اللہ کے بزرگوں کے انوار یہاں تک محسوس ہوتے ہیں، خاندان کے بزرگوں نے تکیہ تشریف لیے جانے کی فرمائش کی تو فرمایا کہ کسی دوسرے موقع پر، لیکن بڑا اکرام فرمایا، اس سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا شاہ علم اللہ اور حضرت امام سید احمد شہید کے خاندان سے تعلق ظاہر ہوتا ہے۔

خانوادۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی کے لوگ اور اس کی اہم شخصیتیں حضرت امام سرہندی مجدد الف ثانی (م ۱۰۳۴ھ) سے لیکر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) تک اپنے اپنے زمانہ کے ممتاز مشائخ سے وابستہ رہیں، خود راقم سطور کے دادا سید خلیل الدین حسنی صاحب (م ۱۹۳۲ء) کا بیعت و استرشاد میں تعلق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے تھا اور راقم کے نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی (والد ماجد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی) بھی گنگوہ استفادہ کے لئے حاضر ہوئے اور ان کی توجہات حاصل کیں، بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، جس کا شروع میں اشارہ کیا جا چکا ہے، خاندان کے متعدد افراد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی (م ۱۹۴۴ء) حضرت مولانا

---

[1] پرانے چراغ، حصہ اول، ص: ۱۰۹-۱۱۰۔

سید حسین احمد مدنی (۱۹۵۷ء) حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری (م۱۹۶۲ء) اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب (م۱۹۸۲ء) سے وابستہ رہے۔اور بعض نے عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑہی صاحب سے تعلق رکھا اوران سب حضرات کی تکیہ رائے بریلی تشریف آوری ہوتی رہی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی خانوادۂ علم اللہ کے اس وصف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''خاندان کے انساب وتاریخ اور محفوظ تذکروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کا رشتہ ہمیشہ کسی نہ کسی طرح سے شریعت اور طریقت سے مربوط رہا، اوراس میں ایک طرف علماء ربانی پیدا ہوتے رہے،تو دوسری طرف مشائخ روحانی جن میں سے بعض مشائخ کا سلسلہ دور دور پہونچا اور بڑے بڑے صاحب باطن، عالی نسبت شیوخ اس سلسلہ میں منسلک نظر آتے ہیں، نیز یہ کہ اس خاندان کے افراد نے (جن میں تزکیۂ نفس اور دولت باطنی کے حصول کی طلب تھی) اپنے زمانہ کے صحیح العقیدۃ، داعیٔ سنت اور صاحب کمال مشائخ کی طرف بلا تکلف رجوع کیا اوران سے علمی فیض اور باطنی نعمت حاصل کی اور اس میں کسی خاندانی زعم یا احساس برتری کو حائل نہیں ہونے دیا، نہ بعد مسافت اور سفر کی مشقتوں کو خاطر میں لائے، چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارنامے کے بعد تقریبا پورا خاندان ان کے خلیفۂ اعظم حضرت سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہوگیا، نیز اس خاندان کے افراد وقتاً فوقتاً حضرت مجدد کی اولاد امجاد سے رجوع واستفادہ کرتے رہے، پھر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں علم اللہی خاندان ان سے اور (ان کے بعد) حضرت شاہ عبد العزیز سے وابستہ ہوا اوران کی دعوت واصلاح اور خیالات کا علم بردار بن گیا''[1]

---

[1] کاروان زندگی،ص:۲۸-۲۹،جلداول۔

مفتی محمد زید صاحب مظاہری ندوی نے اس تعلق کو اس کتاب کا موضوع بنایا ہے،
عزیز مکرم مفتی محمد زید صاحب ندوی استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء کا تصنیف وتالیف کے کام سے اشتغال شروع سے رہا ہے اور انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اور ان کی تصنیفات اور مواعظ وملفوظات کو خصوصیت سے موضوع بنایا اور ان کے علوم ومعارف کو عام فہم اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی، اس طرح ان کی ۸۰ سے زائد کتابیں سامنے آچکی ہیں، یہ ان کے لئے سعادت کی بات ہے کہ ان کو شروع سے عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی حاصل رہی جن کے مدرسہ عربیہ ہتورہ، باندہ میں وہ تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، ان کی وفات کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء منتقل ہوگئے اور انہوں نے اس طرف توجہ کی کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور ندوۃ العلماء کی ممتاز شخصیات کے درمیان جو علمی ودینی روابط رہے وہ بھی سامنے لائے جائیں، اس کے لئے انہوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کے تعلق سے پہل کی، چنانچہ انہوں اپنی اس کتاب میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی اور خاندان کے دوسرے بزرگوں اور افراد کا حضرت تھانوی اور ان کے خلفاء سے جو عقیدت اور محبت رہی ہے، اس پر روشنی ڈالی ہے اور حضرت تھانوی کا اور ان کے خلفاء جن سے خاندان کے بزرگوں کا ربط رہا ہے، کا تذکرہ کیا ہے، اس کے لئے انہوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں اور تقریروں سے اقتباسات نقل کئے، دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے سامنے مولانا نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ان کو بھی نقل کیا ہے۔

عزیزی مولوی محمود حسن حسنی ندوی جن کو تذکرہ نگاری سے بڑی دلچسپی ہے اور ان کی

تصنیف ''سوانح حضرت مولانا ابرارالحق حقی'' بڑی مقبولیت حاصل کر چکی ہے، نے ایک تعارفی مضمون میں بعض مفید معلومات پیش کی ہیں، اس سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے، امید ہے کہ یہ کتاب اہل علم اور اہل تقوی کے درمیان ربط پیدا کرنے میں معین ثابت ہوگی اور اس کی اس زمانۂ عقلیت میں بہت ضرورت ہے، علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے کہا ہے:۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بتکدۂ تصورات
صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

محمد واضح رشید حسنی ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۵ / ربیع الاول / ۱۴۲۹ھ ۳ / اپریل / ۲۰۰۸ء

عرض مرتب

باسمہ سبحانہ وتعالی

اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل وکرم اور اس کا احسان ہے کہ اس نے زمانہ طالب علمی سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے علوم ومعارف وحقائق جو آپ کی سیکڑوں تصانیف ملفوظات ومواعظ میں بکھرے ہوئے ہیں ان سب کو علحدہ علحدہ موضوع اور عناوین کے تحت یکجا اور مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائی، چنانچہ اس سلسلہ کی متفرق موضوعات سے متعلق اب تک تقریباً ستر ۷۰ کتابیں مرتب ہوچکی ہیں۔

اسی ضمن میں یہ کام بھی سامنے آیا کہ حضرت اقدس تھانویؒ کے معاصر کبار علماء ومشائخ اور مشاہیر امت کی علمی واصلاحی وفقہی مکاتبت ومراسلت جو حضرت تھانویؒ سے ہوئی ہے مرتب کردی جائے، چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کاندھلویؒ وغیرھم کی حضرت اقدس تھانویؒ سے علمی وفقہی مراسلت زیر ترتیب ہے۔

ایک عرصہ سے خیال تھا کہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مشاہیر وکبار علماء کی حضرت اقدس تھانویؒ سے جو علمی واصلاحی مکاتبت ہوئی ہے اور ان حضرات نے جو کچھ حضرت اقدس تھانویؒ کے متعلق تحریر فرمایا ہے، ان سب کو بھی یکجا اور مرتب کردیا جائے، چنانچہ احقر نے اس سلسلہ کی کتابیں، مختلف مقالات اور پرانی فائلوں اور ممکنہ مواقع میں ایسے مضامین تلاش کئے، الحمد للہ اپنی کوشش ومحنت میں کامیاب ہوگیا۔

چنانچہ علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا عبد الباریؒ صاحب ندوی حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادیؒ کی حضرت اقدس تھانویؒ سے جو علمی واصلاحی اور فقہی

مراسلت ہوئی اوران حضرات نے حضرت اقدس تھانویؒ کی منقبت میں جو کچھ تحریر فرمایا وہ سب علیحدہ علیحدہ رسالوں میں یکجا اور مرتب ہو چکا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کی طباعت ونشر واشاعت کی صورتیں آسان فرمادے۔

اسی سلسلہ میں داعیہ پیدا ہوا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حضرت اقدس تھانویؒ سے جو مراسلت ومکاتبت ہوئی وہ اور حضرت اقدس تھانویؒ کا حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبت سے اس خاندان سے جو قریبی تعلق رہا ہے، نیز حضرت اقدس تھانویؒ کی لکھنؤ حضرت کے مکان پر تشریف آوری اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تھانہ بھون حاضری کی تفصیل اور حضرت اقدس تھانویؒ کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ سب بھی مرتب اور یکجا کر دیا جائے۔

احقر کا خیال تھا کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی چیزیں کم مل سکیں گی، لیکن احقر نے اس سلسلہ میں جب حضرت مولاناؒ کی مختلف کتابوں، مضامین اور خطبات وتقاریر کا مطالعہ کیا اس سے اندازہ ہوا کہ حکیم الامت حضرت اقدس تھانویؒ سے نہ صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بلکہ حضرت کے خاندان کا حضرت تھانویؒ سے گہرا اور خصوصی ربط رہا ہے۔

علمی میدان میں دیکھا جائے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم (صاحب نزہۃ الخواطر حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ جو بڑے درجہ کے عالم شیخ مربی ومؤرخ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم تھے) نے حضرت اقدس تھانویؒ کا شرف تلمذ حاصل کیا تھا چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بڑے بھائی جناب مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں :

"جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے آپ (یعنی حضرت مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ صاحب کانپور گئے وہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے سامنے زانوے تلمذ تہ

کیا، اوران کی شفقتیں و محبتیں لیں۔[1]

روحانی منازل اور سلوک کے مدارج طے کرنے کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ جو حضرت اقدس تھانویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بھی شیخ اور پیرو مرشد تھے، اور حضرت حاجی صاحب کے بعد حضرت تھانویؒ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو بمنزلہ پیر کے سمجھتے تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا کے بعض خاندانی افراد جناب سید خلیل الدین صاحب جو حضرت مولانا محمد رابع صاحب (موجودہ ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے دادا جان تھے وہ بھی حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے، اور خود مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم حضرت مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے نہ صرف بیعت تھے، بلکہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے آپ کو بیعت وارشاد کی اجازت بھی عطا فرمائی، چنانچہ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ اپنے والد ماجد کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”منازل سلوک اپنے خسر حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب اور اپنے والد ماجد اور شاہ عبدالسلام صاحب حسینی ہنسوی کے بعض خلفاء کی خدمت میں طے کئے، اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ جو کہ مکہ معظمہ ہجرت کر چکے تھے، سے خط کے ذریعہ بیعت کی اور اجازت بیعت وارشاد بھی فرمائی“۔[2]

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد محترم ایک طرف اگر حضرت تھانویؒ کے شاگرد تھے تو اس کے ساتھ ساتھ پیر بھائی بھی تھے، اور حضرت مولاناؒ کے خاندان کا حضرت اقدس تھانویؒ سے روحانی و باطنی ربط بھی تھا، اور یہ سب منجانب اللہ تھا، چنانچہ اسی سلسلہ کا مشہور واقعہ ہے کہ مفکر اسلام حضرت مولانا کے

---

[1] مقدمۃ کتاب حدیث نبوی۔ص:۱۶ [2] مقدمۃ حدیث نبوی۔ص:۱۸۔

بعض خاندانی بزرگ جناب سید خلیل الدین صاحب (حضرت مولانا رابع حسنی ندوی ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دادا جو حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے) نے ایک مرتبہ شاہ علم اللہ صاحب کو خواب میں دیکھا فرمارہے ہیں کہ رائے بریلی اسٹیشن سے ایک بزرگ حضرت تھانویؒ گذر رہے ہیں ان کو تکیہ (رائے بریلی) آنے کی دعوت دیں، یعنی خواب میں حضرت تھانویؒ کو تکیہ رائے بریلی تشریف آوری کی درخواست کی تلقین کی گئی تھی چنانچہ اس خواب اور انشراح قلبی کی بنا پر خادم کو اسٹیشن بھیجا گیا، دیکھا تو واقعی وہ بزرگ صفت انسان حضرت اقدس تھانویؒ اسٹیشن پر ٹہل رہے ہیں خادم نے جاکر ادب سے خواب کی پوری تفصیل عرض کی اور تشریف آوری کی درخواست کی، حضرت اقدس تھانویؒ نے بعض مصالح کی بناء پر اس وقت اس درخواست کو منظور نہ فرمایا، لیکن بعد میں اللہ تعالی نے ایسے حالات پیدا فرمائے کہ جس وقت مفکر اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان لکھنؤ میں مقیم تھا اس وقت حضرت اقدس تھانویؒ تکوینی نظام کے تحت بسلسلہ علاج لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً چالیس دن قیام رہا، اس موقع پر حضرت اقدس تھانویؒ حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے مکان پر بغیر کسی درخواست کے ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ از خود تشریف لائے، جس کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''پھر وہ وقت آیا کہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھنؤ کے قیام کے دوران اپنی خواہش اور تقاضائے قلبی سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک ہمارے مکان پر تشریف لے آئے، بھائی صاحب نے کہا کہ ''محمد کو لاؤ'' میں دوڑا ہوا گیا اور ان کو گود میں لے کر آیا مولانا نے ان کے سر پر دست شفقت پھیرا، پھر اگست ۱۹۴۱ء میں جب دوبارہ تشریف آوری ہوئی اور ان کی مکتب نشینی کا وقت آگیا، مولانا ہی نے ان کی بسم اللہ کرائی، کیا عجب ہے کہ ان کی وہبی تحریری صلاحیت میں یہ برکت بھی رہی ہو۔'' ☆

☆ ماخوذ از تعمیر حیات خصوصی شمارہ سن طباعت ۱۹۸۰ء ص: ۱۵۱۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے خاندان کا حضرت تھانویؒ سے علمی وروحانی اور عقیدت ومحبت اور عظمت کا گہرا تعلق برابر قائم رہا ہے، اسی وجہ سے حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کوتاکیدی انداز میں ۱۹۳۴ء تھانہ بھون حاضری اور قیام کی ہدایت فرمائی تھی۔[1]

چنانچہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے تھانہ بھون کے اسفار بھی ہوئے، خانقاہ تھانہ بھون اور حضرت تھانویؒ کے فیض سے مستفید بھی ہوئے۔ اور استفادہ کا یہ سلسلہ کسی نہ کسی نوعیت سے اخیر تک باقی رہا چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی تھانہ بھون حاضری اور حضرت تھانویؒ کی لکھنؤ تشریف آوری کا تذکرہ کرتے ہوئے اخیر میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت معنوی اور علمی استفادہ اور محبت وعقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا، بھائی صاحب سے بھی کبھی کبھی مراسلت ہوتی''۔[2]

اسی کا اثر تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے سامنے جب کبھی حضرت تھانویؒ کا ذکر آتا تو بڑی قدر وعظمت اور محبت سے نام لیتے اور ذکر خیر فرماتے، حضرت اقدس تھانویؒ کے افادات کے مجموعے جو احقر نے مرتب کئے ہیں بعض مجموعوں پر تقریظ لکھنے کی درخواست کی تو حضرت نے بڑی شفقت ومحبت اور رغبت سے قبول فرمایا اور حضرت اقدس تھانویؒ کی نسبت سے بڑی قدر وعظمت کے ساتھ تقریظ تحریر فرمائی، جس میں حضرت اقدس تھانویؒ کے بعض خصوصی کمالات اور تجدیدی کارناموں کی ہمہ گیری کا ذکر بھی فرمایا، حضرت اقدس مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے خطبات وتقاریر میں حضرت تھانویؒ کی کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے اور جو حضرات آپ سے منسلک اور سلسلہ

---

[1] پرانے چراغ ج اول ص ۱۲۰ [2] پرانے چراغ ج ا ص ۱۳۱۔

بیعت میں داخل ہوتے ان کو خاص طور پر حضرت اقدس تھانویؒ کے ملفوظات ومواعظ کے مطالعہ کی ہدایت وترغیب فرماتے تھے[1]

الغرض مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی تصانیف اور آپ کے مقالات وخطبات کے محدود وناقص مطالعہ میں مجھے حضرت اقدس تھانویؒ کا جہاں کہیں تذکرہ ملا وہ سب مضامین اور اس کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی حضرت تھانویؒ سے جو مراسلت ومکاتبت ہوئی اور حضرت اقدس تھانویؒ کی منقبت اور آپ کی تصانیف ملفوظات ومواعظ کے سلسلہ میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ان سب کو اس رسالہ میں یکجا اور مرتب کرنے کی کوشش کی ہے، جس میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے تھانہ بھون سفر کی روداد بھی ہے، اور حضرت تھانویؒ کے لکھنؤ تشریف آوری کے موقع کی پر لطف داستان بھی، اور حضرت تھانویؒ کے ملفوظات ومواعظ اور تصانیف سے متعلق ہدایات بھی، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اس معمولی کوشش کو قبول فرمائے اور امت کے لئے نافع بنائے۔

رسالہ کا معتدبہ حصہ پرانے چراغ سے ماخوذ ہے، جس کے متعلق حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں۔

”اس بزم میں ان حضرات کو بھی شرکت فرمانے کی زحمت نہیں دی گئی جنہیں مصنف کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے اور زیادہ برتنے کا موقع نہیں ملا، اور اس کی واقفیت ان سے ”دید وشنید“ کبھی کبھی کی ملاقاتوں اور چند خطوط کی حد سے آگے نہیں“[2]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت حکیم الامتؒ سے قریبی تعلق بھی رہا اور بکثرت بہت قریب سے دیکھنے سننے کا موقع ملا، جس کی تفصیل آپ کو انشاء اللہ اس رسالہ میں ملے گی۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے علاوہ حضرت تھانویؒ

---

[1] سلاسل اربعہ [2] پرانے چراغ، ج۱ص:۱۲۔

کے بعض خلفاء سے بھی حضرت مولاناؒ کا گہرا ربط اور خصوصی تعلق رہا، چنانچہ حضرت شاہ وصی اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آپ کثرت سے تشریف لے جاتے تھے، اور بکثرت خط وکتابت کا بھی سلسلہ جاری رہا، آپ کی وفات پر خانقاہ میں آپ نے نہایت مؤثر تقریر فرمائی تھی جس سے آپ کے والہانہ اور قلبی وروحانی تعلق اور فطری مناسبت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ سے بھی آپ کا نہایت محبت وعظمت کا تعلق تھا، بسا اوقات آپ خاص طور پر بعض ہدایا وتحائف بھیجا کرتے تھے، اور آپ کے بعض خاندانی افراد بکثرت بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ ہردوئی حضرت مولانا ابرار الحق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور خود حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ بھی اسی تعلق ومحبت کے نتیجہ میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ بار بار تشریف لاتے تھے۔

حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ناظم ندوۃ العلماء تحریر فرماتے ہیں:

"ادھر چند برسوں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء اور حضرت مولانا کے درمیان قریبی ربط ہوگیا تھا، حضرت مولانا ندوۃ العلماء تشریف لاتے اور بڑے انشراح کے ساتھ طلبہ واساتذہ سے خطاب فرماتے، طلبہ واساتذہ کو بھی حضرت مولانا سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملتا"[1]

نیز تحریر فرماتے ہیں "استفادہ کے لئے ہر طرف سے لوگ پہنچتے تھے، مجھے اور میرے رفقاء کو برابر اپنی تشنگی بجھانے کے لئے حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا جو خلا پیدا ہوا ہے کس طرح اس کی تلافی ہوسکے گی یہ سمجھنا مشکل ہورہا ہے"[2]

اہمیت وافادیت کے پیش نظر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مضمون جو حضرت

---

[1] ماخوذ از حیات ابرار ص ۵۳۷ [2] تعزیتی مکتوب ماخوذ از محی السنہ ص ۱۱۔

شاہ وصی اللہ صاحبؒ کے متعلق تحریر فرمایا نیز شاہ صاحب سے آپ کی مکاتبت اور وفات پر کی گئی دلنشین پر مغز تقریر اور حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ کے نام بعض خطوط بھی رسالہ کے اخیر میں لاحق کردیئے گئے ہیں۔ اہل اللہ کے تذکروں سے قلب میں تازگی اور روحانیت میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ پاک محض اپنے فضل وکرم سے اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔

احقر مرتب کتاب نے اس کتاب کا کتابت شدہ مسودہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندوی مدظلہٗ (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی صاحب ندوی (معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء) کی خدمت میں پیش کیا، احقر کے لئے بڑی مسرت وخوش نصیبی کی بات ہے کہ توقع سے کہیں زائد احقر کے اس کام کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بلند کلمات سے احقر کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی، حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب نے پورے انشراح سے تقریظ اور دعائیہ کلمات تحریر فرمائے اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی صاحب نے بڑی بشاشت سے کتاب کا مقدمہ تحریر فرمایا، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے تعلق سے اس رائے کا بھی اظہار فرمایا کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خاص تصانیف اصلاح الرسوم وبہشتی زیور وغیرہ کا خاندان میں پڑھنے کا رواج رہا اس کا بھی ذکر آنا چاہیئے، نیز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تعلق حضرت تھانویؒ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ حضرت تھانویؒ کے بعد ان کے خلفاء سے بھی قریبی تعلق رہا، اس کا بھی تذکرہ آنا چاہیئے، چنانچہ حضرت مولانا کی رائے کے مطابق انہیں کے ایماء پر مولوی محمود حسن صاحب حسنی ندوی دامت برکاتہم نے یہ خدمت انجام دی، جو ضمیمہ کے طور پر کتاب کا جزء بن کر شائع ہو رہا ہے۔

میں اپنے اکابر کا احسان مند وشکر گذار ہوں کہ کتاب کی تقریظ ومقدمہ لکھ کر احقر کی ہمت افزائی فرمائی، نیز مولوی محمود حسن حسنی ندوی کا بھی بہت بہت شکر گذار ہوں کہ انہوں

نے کتاب کا مبسوط مقدمہ اور ضمیمہ تحریر فرمایا جو کتاب کے شروع اور آخر میں لاحق ہے۔

مقدمہ میں موصوف نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے عقیدت ومحبت کا گہرا ربط صرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ خاندان کے دوسرے افراد اہل علم کا بھی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے عقیدت ومحبت کا تعلق تھا۔اور ضمیمہ میں موصوف نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ تعلق صرف حضرت تھانویؒ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ حضرت تھانویؒ کے بعد ان کے اجلۂ خلفاء سے بھی گہرا ربط رہا، اور تادم حیات قائم رہا۔اللہ تعالیٰ سب ہی حضرات کو اپنی شایان شان جزائے خیر نصیب فرمائے

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا

انک انت التواب الرحیم.

محمد زید مظاہری ندوی

استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳۰ر شوال ۱۴۲۶ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

اورخانوادۂ علم اللٰہی کی شخصیات

ایک تجزیہ

از (مولانا) محمود حسن حسنی (صاحب) ندوی تکیہ کلاں رائے بریلی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ دین میں تزکیہ واحسان کے شعبہ کے مجدد وامام تسلیم کئے گئے ہیں، انہوں نے صحیح معیاری اور اچھی وپاکیزہ زندگی گزارنے اور مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لیے کتاب وسنت کی روشنی میں جو اصول وضع کئے ان سے مختلف مکاتب فکر اور سلاسل تصوف وحلقہائے دعوت وارشاد نے فائدہ اٹھایا اور لوگوں کی تربیت وتوجیہ میں ان سے کام لیا انہی میں ایک وہ خاندان بھی ہے جسے خانوادۂ علم اللٰہی کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی شخصیات میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور آخر دور میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ شہرت پائی، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا دور تیرھویں صدی ہجری کا دور ہے وہ اپنے دور کے امام ومجدد اور مصلح تھے، بعد کی شخصیات نے اپنے کو ان کے ہی سایہ میں سمجھا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحب بانی جماعت تبلیغ نے ایک موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے فرمایا تھا کہ ہم حضرت سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) کی تجدید کے

سائے میں ہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے استاد ومربی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی حضرت سید صاحب شہید کے سلسلہ میں بڑے بلند کلمات ارشاد فرماتے ہیں، انہوں نے یہاں تک فرمایا کہ:

''سب مشائخ طبیب امت ہیں' اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں کے اعتبار سے انہوں نے طریق رکھے ہیں، سب کا مآل ایک ہے، اور سب کا خلاصہ اتباع سنت ہے، بعد کو لوگوں نے بدعتیں داخل کردی تھیں، ان کے مجدد حضرت سید صاحب ہوئے''[1]

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی جو حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے شیخ ومرشد تھے حضرت سید صاحب کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے حضرت سید صاحب نے ان کو دعا دی تھی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ تبرکاً بیعت بھی فرمایا تھا، ان کے شیخ میانجی نور محمد جھنجانوی حضرت سید صاحب کے مجاز بیعت بھی تھے، حضرت سید صاحب طرق ثلاثہ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ میں اجازت دیا کرتے تھے[2]

اور حضرت میانجی نور محمد صاحب کے شیخ حاجی عبدالرحیم دلایتی سہارن پوری حضرت سید صاحب اور ان کی جماعت مجاہدین کے ساتھ لشکر کفار سے جہاد کرتے ہوئے شہید بھی ہو گئے تھے، وہ حضرت سید صاحب کے فضل اور علو مرتبت کے نہایت معترف تھے اور اسی لئے انہوں نے سب کچھ چھوڑ کر حضرت سید صاحب کی اتباع وانقیاد اختیار کی تھی اور اپنے متوسلین کو بھی حضرت سید صاحب سے جوڑ دیا تھا۔[3]

---

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ دوم ص ۵۵۴ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

[2] حضرت سید صاحب کے طریقۂ تعلیم سلوک واشغال اور طریقۂ اجازت وخلافت کیلئے ملاحظہ ہو ''خیرا لمسالک'' از حضرت مولانا سید محمد ظاہر حسنیؒ اور رسالۂ اشغال از حضرت سید شاہ نفیس الحسینی مدظلہ۔

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ سیرت سید احمد شہید جلد دوم از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی حضرت سید احمد شہیدؒ سے خاص نسبت اور عقیدت ومحبت

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے جس مدرسہ میں تعلیم حاصل کی اور جس خانقاہ سے تربیت پائی ان دونوں پر چھاپ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، حضرت تھانویؒ کا حضرت شہید سے تعلق ان کے مواعظ وملفوظات میں بھی جھلکتا ہے اور مکتوبات میں سے ایک مکتوب سے گہرے تأثر کا پتہ چلتا ہے[1] یہ وہ مکتوب ہے جو حضرت تھانوی نے حضرت مولانا منظور نعمانیؒ کو ان کے ایک ہدیہ کتاب اور اس سے منسلک خط کے جواب میں تحریر کیا تھا، اس سے اس حصہ کو جس سے حضرت سید صاحب کی شخصیت سے گہرے تأثر کا پتہ چلتا ہے، پرانے چراغ مصنفہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے نقل کیا جاتا ہے۔

''اس ہدیہ سے خصوص سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے ایک مسرت کا دوسرا خجلت کا وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے، کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کررہے ہیں کہ بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں۔☆ [1]

تعلیم وافادہ اور تعلّم واستفادہ کا یہ ایک سلسلہ تھا جو جزوی تغیرات کے ساتھ جاری رہا، جس گھرانہ کے عظیم فرد سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے

☆ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے ملفوظات میں ہے:

''سنا ہے کہ جہاں جہاں حضرت سید صاحب کے قدم پہنچ گئے وہاں پر بدعت کا زور نہیں رہا اور جہاں پر نہیں پہنچے وہاں پر بدعت کا زور ہے، یہاں پر تھانہ بھون میں بھی حضرت سید صاحب تشریف لائے ہیں بحمد اللہ یہاں پر کوئی جماعت بدعتیوں کی نہیں''

زید (ملفوظات حکیم الامت ص ۲۰۳ قسط ۲)

[1] جلد اول ص: ۱۲۷

اساتذہ ومربیوں نے بالواسطہ استفادہ کیا تھا، اسی گھرانہ کے افراد حضرت مولانا تھانوی کے اساتذہ اور مربیوں کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران میں سے بعض نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے براہ راست بھی فیض اٹھایا۔

حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے ایک نواسہ مولانا سید محمد عرفان (م ۱۹۱۴ء) دارالعلوم دیوبند استفادہ کے لیے آئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا یعقوب نانوتوی سے کسب فیض کیا۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ہشتم)

یہ دونوں حضرات حضرت مولانا تھانویؒ کے ان اساتذہ میں ہیں جن سے وہ سب سے زیادہ مرتبط رہے۔

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کا حکیم الامت حضرت تھانویؒ اور علماء دیوبند سے خصوصی تعلق واستفادہ

حضرت مولانا سید حکیم سید عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ (والد ماجد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) نے حضرت مولانا تھانویؒ سے تعلیمی استفادہ کیا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت تھانویؒ کا کانپور میں قیام تھا پھر ایک سفر میں گنگوہ جا کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضری دی، اور علمی وروحانی استفادہ کیا اور حدیث مسلسل بالاولیۃ کی اجازت بھی لی، مزید باطنی استفادہ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بھی بذریعہ مراسلت کیا، اور حضرت حاجی صاحب نے اپنے مکتوب عالی کے ذریعہ انہیں داخل سلسلہ فرما کر مجاز بیعت وارشاد بھی کیا۔

[1] مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پہلی حاضری کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے میری اس وقت عمر تیرہ سال تھی وہ اس وقت اپنے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔ فیض الرحمٰن کی کتاب حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور ان کے خلفاء ناشر مجلس نشریات اسلام کراچی،

بعد میں مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی حسنی (برادر اکبر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) ندوۃ العلماء سے تعلیم مکمل کر کے دار العلوم دیوبند گئے انہوں نے خصوصیت سے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا انور شاہ صاحب کشمیری سے حدیث میں استفادہ کیا، اوران کا درس عربی میں قلمبند کیا، مگر افسوس ہے کہ یہ کاپیاں جسے وہ بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے تھے مطالعہ کے لیے ایک صاحب لے گئے اور پھر واپس کرنے کی زحمت نہ کی، جس کے باعث یہ علمی ذخیرہ سامنے نہ آسکا۔

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کی حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے طبعی ومزاجی مناسبت اور خصوصی تعلق واستفادہ

مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت تھانوی سے طبعی ومزاجی مناسبت تھی

اور وہ ان کے طرز تعلیم وتربیت وطریقۂ دعوت وتبلیغ کے بڑے قائل تھے، اوران کے ذوق نفاست سے ہم آہنگ تھے، وہ ان کی تربیتی توجیہات کو بہت مفید سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے متعدد لوگوں کو حضرت مولانا تھانوی سے استفادہ کے لیے ترغیب دی، اور اپنی زیر نگرانی دعوتی کام خصوصا غیر مسلموں میں دعوتی کام میں اشتغال رکھنے والے بعض افراد کو حضرت تھانوی کے پاس تربیت کے لیے بھیجنا چاہا، بلکہ بعض کو بھیجا بھی اس سلسلہ میں ایک نام سکندر صاحب کا ملتا ہے مگر تفصیل معمول نہ ہوسکی، اوراپنے صاحبزادے مولانا سید محمد الحسنی مرحوم کی "بسم اللہ" حضرت تھانوی سے ہی کرائی۔

اس تسمیہ خوانی کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی لکھتے ہیں:

۱۹۳۹ء میں جب کہ محمد میاں کی عمر چار سال کی تھی گھر میں تعلیم کے لیے بٹھائے گئے اوراپنی بہنوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے لگے تھے، مگر قاعدے سے ۱۹۴۱ء میں جبکہ حضرت

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تو کسی تاریخ کو بعد ظہر خواص کی مجلس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی محمد میاں کو لے گئے حضرت نے پاس بلایا اور بسم اللہ کرائی محمد میاں کے ساتھ حضرت تھانوی کے ایک مسترشد مولوی عبداللہ صاحب کشمیری کے لڑکے عبیدالرحمٰن بھی تھے ان دونوں نے پڑھا محمد میاں نے آہستہ آواز میں پڑھا اور عبیدالرحمٰن نے بلند آواز میں، حضرت تھانوی نے محمد میاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ بچہ نقشبندی ہوگا۔ اور عبیدالرحمٰن کو فرمایا کہ یہ چشتی ہوگا۔ بسم اللہ کی یہ مجلس بڑی بارونق اور نورانی تھی، ہر طرف علماء فضلاء اور اہل اللہ موجود تھے، محمد میاں اپنی کم عمری کے دور کے یہ دونوں واقعوں کو اپنی علمی و دینی زندگی کی ترقیات کا منبع سمجھتے تھے اور اس ابتدا پر بڑا کیف و سرور اور اپنی خوش بختی محسوس کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت تھانوی سے بہت زیادہ تعلق تھا اور ان کے دل میں حضرت مولانا کی عظمت اور محبت بلکہ کسی درجہ کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اکثر ان کی تصانیف پڑھا کرتے تھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔ [1]

ڈاکٹر صاحب حضرت تھانوی کے لکھنؤ قیام کے دنوں میں برابر ان کی مجلس میں جاتے، حضرت تھانوی ان کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، قریب بٹھاتے اور ایک دن خود اپنے تقاضے سے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پیدل چل کر تشریف لائے آپ کے گھر کے دیگر افراد بھی حضرت تھانوی کی مجلس میں شریک ہوتے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو اس کا بڑا خیال رہتا تھا،

ڈاکٹر صاحب کے گھر کے دیگر افراد میں ان کے بڑے داماد الحاج جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب اطال اللہ بقاءہ (راقم کے دادا) اور مولانا سید محمد ثانی حسنی مرحوم (راقم کے نانا) بھی حاضر مجلس ہوئے۔ [2] مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ کو بھی اس کی سعادت ملی۔

---

[1] تعمیر حیات مولانا محمد الحسنی نمبر ص ۱۸۴

[2] مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پہلی حاضری کا حال لکھتے ہوئے لکھا ہے میری اس وقت عمر تیرہ

سال تھی وہ اس وقت اپنے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے ساتھ مجلس میں حاضر ہوئے تھے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس سرہٗ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی تھانہ بھون بھی تشریف لے گئے اور حضرت کا اعتماد و تعلق حاصل کیا، مراسلت بھی کی مجلسوں میں حاضری دی، ان کی کتابوں مواعظ و ملفوظات کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے خلفاء سے ربط و تعلق رکھا اور بعد میں حضرت کے خلفاء کی خصوصا حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری کی بڑی شفقتیں اور عنایتیں حاصل کیں، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، شاہ عبدالغنی پھولپوری کی توجہات حاصل کیں۔ [1]

حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت تھانوی کے مدینہ منورہ میں مقیم ایک خلیفہ شاہ محمد موسیٰ نے ان کی نوعمری میں اجازت بیعت وارشاد سے بھی سرفراز کردیا تھا، باوجودیکہ ان کا بیعت واصلاح کا تعلق حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے تھا، اس کی وضاحت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی علیہ الرحمۃ نے اپنے ایک مضمون میں جو مولانا مرحوم کی وفات پر رضوان لکھنؤ کی خصوصی اشاعت کے لیے لکھا تھا کی ہے، اور مولانا مرحوم کی کتاب ''لبیک اللّٰھم لبیک'' کے مقدمہ میں صراحت فرمائی ہے۔

مظاہر علوم سہارنپور میں دورۂ حدیث کی تعلیم کے دوران انھیں جن اساتذہ و مشائخ کی شفقت وتوجہ حاصل ہوئی ان میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے علاوہ جو اساتذہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں وہ سلسلہ تھانوی کے دو ممتاز مشائخ ہیں، مولانا سید محمد مرتضیٰ صاحب بستوی رحمۃ اللہ علیہ (سابق ناظر کتب خانہ ندوۃ العلماء) جو

ان کے مظاہر علوم کے زمانہ کے ساتھی ہیں لکھتے ہیں:

۱؎ جس کی تفصیلات کتاب کے مطالعہ سے حاصل ہوں گی۔

''خانوادۂ حضرت سید احمد شہید سے تعلق نیز اپنی اعلی صفات کی بنا پر حضرات اساتذہ خصوصا حضرت مولانا عبدالرحمٰن کاملپوری اور حضرت مولانا اسعداللہ صاحبؒ ان سے بڑی محبت فرماتے اور طلباء میں ان کے ساتھ عظمت واحترام کا معاملہ کرتے'' ۱؎

عارف باللہ حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی اپنے زمانہ تعلیم میں مولانا سید محمد ثانی حسنی سے ربط وتعلق کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا ثانی سے روزانہ بعد عصر ایک مجلس میں ملاقات ہوتی تھی، بات بھی ہوجاتی تھی اکثر مولانا ثانی حضرت مولانا شاہ اسعداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے وہاں کچھ صحبت رہتی تھی'' ۲؎

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) کا حضرت تھانوی اوران کے خلفاء سے خصوصی ربط

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی زیارت کی ان کی مجلس میں حاضری دی اوران کے بعض خلفاء کا خصوصی اعتماد بھی حاصل کیا، ان کے طریقہ دعوت وتربیت کا خصوصیت سے مطالعہ کیا، اوران کو یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ انہوں نے حضرت کے ایک ممتاز خلیفہ اورندوۃ العلماء کے نامور فاضل مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب تجدید تصوف وسلوک (جواصلا حضرت تھانوی کی تعلیمات کی روشنی میں تصنیف کی گئی تھی) کا عربی ترجمہ ''بین التصوف والحیاۃ'' کے عنوان سے کیا جو بعد میں ''المنهج الإسلامی لتربية النفس'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

اسی طرح حضرت تھانوی کے ایک دوسرے ممتاز خلیفہ حضرت مولانا اسعد اللہ

۱؎ رضوان ''مولانا محمد ثانی حسنی نمبر'' ص ۱۳۵ ۲؎ حوالہ سابق۔

صاحب رامپوری سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور کی عنایات حاصل کیں، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے از خود انہیں ایک سبق پڑھایا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ان کی عنایات کا ذکر فرماتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں:

''ایک نشست میں مجھ سے فرمایا کہ تم سے ہمارا تعلق استاذ وشاگرد کا بھی ہو جانا چاہئے میں نے عرض کیا کہ میں بالکل حاضر ہوں یہ میرے لیے شرف کی بات ہے، فرمایا کتاب لاؤ تفسیر کشاف جو اسوقت میرے درس میں تھی میں لے آیا، فرمایا: پڑھو میں نے ان کے سامنے پڑھا اسکے بعد مجھ سے فرمایا کہ تم میرے شاگرد ہو گئے'' ۱؎

آخر میں محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب کی مولانا مدظلہ کی طرف خصوصی توجہ تھی، وہ مولانا کو اپنے یہاں جلسہ میں مدعو کرتے، تقریر کراتے، اور ان کی ہر آمد پر بڑی مسرت کا اظہار فرماتے، نماز کا موقع ہوتا تو امامت کے لیے کہتے جس کا راقم نے بھی کئی بار مشاہدہ کیا، مولانا کی دعوت پر ندوۃ العلماء تشریف لاتے، اور ان کی درخواست پر خطاب بھی فرماتے، قیام بھی فرماتے، اور یہ سب پورے شرح صدر کے ساتھ کرتے۔ مولانا کا حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا قاری محمد طیب دیوبندی سے بھی تعلق و رابطہ رہا اور ان کی عنایتیں و شفقتیں حاصل کیں۔

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا حضرت تھانویؒ کے خلفاء سے خصوصی ربط

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (سکریٹری رابطہ ادب اسلامی عالمی و صدر کلیۃ اللغۃ العربیۃ و آدابہا دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کا تعلق بھی حضرت تھانوی کے بعض

خلفاء سے رہا، جن میں علامہ سید سلیمان ندوی ،مولانا عبدالباری ندوی،

۱ مضمون غیر مطبوعہ۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انھیں حضرت کے ایک نامور خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی کی خصوصی توجہات اوردعائیں اس وقت زیادہ حاصل ہوئیں جب وہ حضرت ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمہ کی مقبول عام تصنیف اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عربی ترجمہ پر نظر ثانی فرمارہے تھے، حضرت کی خدمت میں حاضری کے موقع پر مولانا نے جب حضرت سے دعاء کی درخواست کی تو حضرت نے فرمایا میں آپ لئے دعاء کیوں نہ کروں گا جبکہ آپ ہمارا کام کررہے ہیں یہ سعادت انھیں ۸۴ء میں کراچی پاکستان کے ایک سفر کے موقع پر حاصل ہوئی جب وہ اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی رفاقت میں وہاں حاضر ہوئے تھے۔ مولانا واضح رشید صاحب بھی محی السنہ حضرت مولانا ابرارالحق کے یہاں بار بار حاضر ہونے والوں اوراستفادہ کرنے والوں میں تھے، اور حضرت ان سے بھی بڑی محبت فرماتے تھے، ان کے علاوہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی اور مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی بھی وقتاً فوقتاً حضرت محی السنۃ کی خدمت میں ہردوئی حاضر ہوتے ،اور حضرت کی توجہات حاصل کرتے،

شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے ایک جلیل القدر خلیفہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری کا تعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے خانوادہ علم اللٰہی کے دو عالی مرتبت شیوخ حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی اوران کے شیخ حضرت سید شاہ ضیاء النبی حسنی سے رہا تھا، یہ تعلق ضابطہ کا استرشادی نہیں تھا بلکہ استفادہ ورابطہ کا تھا حضرت مولانا امین صاحب سے خصوصی طور پر استفادہ کیا تھا اور حضرت شاہ

ضیاء النبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے نانا تھے، ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی سے ان کے نانا حضرت شاہ ضیاء النبی صاحب کے متعلق یہ فرمایا کہ میں نے ان سے اچھی نماز پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا تکیہ کلاں رائے بریلی سے خصوصی تعلق و تاثر

اسی طرح حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی کی رائے بریلی میں حضرت شاہ علم اللہ صاحب کی بستی تکیہ کلاں کے بارے میں تعلق و تاثر کی روایت بھی مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری سے ہی منقول ہے انہوں نے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے بیان فرمایا تھا جس کو حضرت مولانا سے ہم لوگوں نے متعدد بار سنا وہ یہ کہ حضرت تھانوی کا ایک طویل سفر میں جو ٹرین سے تھا رائے بریلی سے گذر ہو رہا تھا تو خاندان کی برگزیدہ شخصیت سید خلیل الدین حسنی صاحب مرحوم (جد گرامی مولانا سید محمد رابع حسنی) نے اپنے مورث اعلی حضرت شاہ علم اللہ حسنی کو خواب میں دیکھا کہ وہ فرمارہے ہیں کہ مولانا اشرف علی صاحب یہاں سے گزر رہے ہیں تم ان کو یہاں دعوت نہیں دیتے، یا اسی طرح کی کوئی بات فرمائی، چنانچہ وہ اسٹیشن گئے اور حضرت مولانا تھانوی سے یہ بات عرض کی حضرت کو مسرت ہوئی اور دوسرے کسی موقع پر تکیہ تشریف لانے کو فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اہل تکیہ کے انوار ہمیں یہاں محسوس ہو رہے ہیں۔

سلسلہ تھانویؒ کے مشائخ اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری جو حضرت تھانوی کے سرفہرست

مسترشدین وخلفاء میں شمار کئے جاتے ہیں کا تعلق بھی یہاں کے بزرگوں اور شخصیات سے بہت گہرا تھا وہ خصوصیت سے حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا خواجہ احمد نصیر آبادی، حضرت مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کا نام بڑی محبت واحترام اور عقیدت سے لیتے اوران کے اصلاحی تربیتی ودعوتی کاموں اوران کے حیرت انگیز نتائج کا ذکر کرتے ،اوراس خاندان کے افراد کے ساتھ بڑی محبت وشفقت کا معاملہ فرماتے ۔ا حضرت مولانا علی میاں پران کی شفقتیں بے پایاں رہیں،

حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جن خلفاء اور سلسلہ تھانوی کے دیگر مشائخ سے یہاں کے بزرگوں کا یاان حضرات کا یہاں کی شخصیات سے روحانی وایمانی دینی وعلمی ربط وتعلق رہا ان میں حضرت شاہ وصی اللہ صاحب اور حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کے علاوہ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری ، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی، قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا اسعداللہ صاحب، مولانا مفتی شفیع دیوبندی، حضرت صوفی عبدالرب صاحب ، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، اس تعلق کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتابوں بالخصوص پرانے چراغ (اول دوم سوم) (جس میں انہوں نے اپنے محسنین وخاص متعلقین کے تذکرہ میں حضرت تھانوی اوران کے بعض کبار مسترشدین وخلفاء کا بھرپور تذکرہ کیا ہے)اوران کی خودنوشت سوانح حیات زندگی (۱،۲،۳،۴،۵،۶،۷) کا مطالعہ مفید ہوگا ،اسی طرح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی نے اپنے محسن مشائخ کے سلسلہ میں جو مدحیہ قصائد لکھے ان میں ایک قصیدہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی سے متعلق ہے اورایک قصیدہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے سلسلہ میں ہے،اور حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی نے رجال الفکر والدعوۃ

فــی الا سـلام (عربی) کی آخری جلد الامام احمد بن عرفان الشہید تصنیف کی تو اس میں حضرت مولانا تھانوی کی صفات اور خدمات کو خصوصیت سے اجاگر کیا،

دین کی بنیاد پر قائم ہونے والے ان دو روحانی خانوادوں کے تعلق کو اللہ تعالیٰ قائم ودائم رکھے اور اس کے نتائج وثمرات سے ان خانوادوں کے تمام افراد کو دارین میں مسعود ومحظوظ فرمائے،

اس تعلق کو سلسلہ اشرفی کے ایک صاحب قلم فرد اور ندوۃ العلماء کے استاد حدیث محترم ومعظم مولانا مفتی محمد زید صاحب ندوی مظاہری زیدت مکارمہٗ و مآثرہٗ نے تحریری مواد کے ذریعہ تازہ کرنے کا جو مؤثر کام انجام دیا ہے وہ مستقل کتاب کی صورت میں سامنے آرہا ہے اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو اس کا عظیم صلہ اور اس کی بے پایاں برکات عطا فرمائے انہوں نے از راہ کرم اس حقیر کو بھی اس مضمون کے ذریعہ اپنے اس کام میں شریک کیا۔**فجزاہ اللہ تعالی خیر الجزاء** ۔

محترمی جناب مولانا مفتی محمد زید صاحب ندوی مظاہری دام ظلہٗ کی شخصیت اب کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی ہے وہ اپنی تدریسی اور تصنیفی خدمات کے ذریعہ دینی وعلمی حلقوں میں معروف ہیں، اور وقت کے صحیح استعمال کا اللہ تعالیٰ نے انہیں جو ملکہ عطا فرمایا ہے اس کے نتائج وثمرات مسلسل ظاہر ہورہے ہیں اس طرح ان کا افادہ عام ہوتا جارہا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبولیت عطا فرمائے۔آمین

رقم کردہ

محمود حسن حسنی

دائرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ

تکیہ کلاں رائے بریلی

جمعہ ۸؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ

باب ۱

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کا تکیہ رائے بریلی سے خصوصی تعلق

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ دائرہ شاہ علم اللہ (تکیہ کلاں ضلع رائے بریلی) ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں چوٹی کے علماء اور بڑے بڑے مشائخ آنا اپنی سعادت سمجھتے اور فخر سمجھتے ہیں، مولانا حسین احمد مدنی تشریف لائے کسی نے کچھ کہا تو فرمایا کہ ہمارا تو یہاں چلہ گزارنے کا دل چاہتا ہے اور ایک رات تو ضرور یہاں گزارنے کو جی چاہتا ہے، مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ یہاں سے گذرے تو رائے بریلی کے اسٹیشن پر بڑے بلند الفاظ کہے مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ نے ہمیں خود سنایا کہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی گاڑی یہاں کھڑی تھی پتہ نہیں کیا بات ہوگئی تھی دیر تک ٹھہری تو اتر کر چلنے لگے میں ساتھ ہو گیا مجھ سے فرمایا کہ حضرات تکیہ کے انوار یہاں تک ہیں اور یہاں آنے کا ارادہ فرمایا مگر موقع نہیں ملا"۔[۱] (چراغ زندگی اور دستور عمل، خطبات علی میاں، ج:۶ص:۱۸۶)

---

(۱) حضرت مولانا قمر الزماں صاحب اپنی کتاب اقوال سلف میں تحریر فرماتے ہیں:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی زید مجدھم سے متعدد بار یہ واقعہ سنا کہ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری (اعظم گڑھ) خلیفہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ قدس سرہ نے بیان فرمایا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ تشریف لے جا رہے تھے، جب ان کا گزر رائے بریلی اسٹیشن سے ہوا تو فرمایا حضرات تکیہ کے انوار یہاں نظر آرہے ہیں، ادھر تکیہ دائرۂ شاہ علم اللہ صاحب کے معزز فرد خاندان سید خلیل الدین صاحب جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سے بیعت تھے نے خواب دیکھا کہ حضرت شاہ علم اللہ صاحب فرما رہے ہیں کہ مولانا تھانویؒ کو تکیہ لاؤ چنانچہ انہوں نے ایک شخص کو حضرت مولانا تھانویؒ کی خدمت میں بھیجا اور اس خواب کی بات کہلائی تو ارشاد فرمایا کہ: "اس طرح جانے میں میری شہرت ہوگی اس لئے جانا مناسب نہیں ہے، لہذا دوسرے موقع پر حاضری کی سعادت حاصل کروں گا۔ (اقوال سلف ص:۲۰۵ ج:۳)

حضرت مولانا رحمۃ اللہ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ کا حکیم الامت حضرت تھانویؒ سے شرف تلمذ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنے والد ماجد جناب مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

اسی زمانہ ۱۳۰۳ھ کے آس پاس آپ نے کچھ عرصہ کانپور میں بھی قیام کیا اس وقت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب جامع العلوم پٹکاپور میں صدر مدرس تھے، آپ نے مولانا سے کچھ حصہ اصول الشاسی کا اور کچھ حصہ شرح جامی اور قطبی کا پڑھا۔

مولانا تھانویؒ کو مولانا سید عبدالحی کا وہ زمانہ جب وہ کانپور میں طالب علم تھے باوجود امتداد زمانہ کے یاد تھا، اوران سے تعلق خاطر تھا، وہ مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کے نام ایک خط میں جو رمضان ۱۳۵۰ھ جنوری ۱۹۳۲ء کا لکھا ہوا ہے ان کے خط کی رسید دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ”نامہ محبت شامہ نے مولانا مرحوم یعنی جناب کے والد صاحب کے بچپن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کردیا ان کی یاد سے جیسی بے چینی ہوئی تھی آپ کے بدل ہونے نے اس بے چینی کو چین سے بدل دیا، **فسلمکم اللہ تعالی من مونس مُریح بقلوبنا** . (حیات عبدالحی ،ص:۵۴،از مولانا علی میاں صاحبؒ)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بڑے بھائی جناب مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں :

”جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے آپ (یعنی حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کانپور گئے وہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اوران کی شفقتیں ومحبتیں لیں[1]

---

[1] مقدمۃ کتاب حدیث نبوی ،ص:۱۶

مولانا سید عبدالعلی صاحبؒ کا حضرت تھانویؒ سے تعلق

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ اپنی کتاب فرشتہ صفت انسان میں تحریر فرماتے ہیں:

ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری کی اندرونی و بیرونی پوری زندگی دراصل ’’اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ ‘‘ والے سرتاپا خشیتی علم یا علم ’’رابر دل زنی یارے بو‘‘ کی آئینہ دار تھی۔

یہ زندگی یہی ہے کہ دل میں خدا اتنا رس بس جائے کہ قالب کی ہر جنبش کا محور خدا ہی سے خوف ورجاء یا اس کی رضا وناراضی بن جائے، اس کے بغیر لاکھ سر مارا جائے، انسان کی دنیوی زندگی بھی نہ انفرادی استوار ہوسکتی ہے، نہ اجتماعی، دنیا کے جاہی و مالی محرکات ومطالبات اور نفسانی خواہشات وجذبات کو خدا طلبی وآخرت پسندی کے سوا کوئی دوسری چیز ہرگز اندھیرے اجالے ہر موقع پر قابو میں نہیں رکھ سکتی[1]۔

مولانا عبدالباری صاحب کا مشورہ کے لئے مولانا عبدالعلی صاحب کا انتخاب اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کا خوشی کا اظہار

ڈاکٹر صاحب کوئی تارک الدنیا قسم کے دیندار بالکل نہ تھے۔ڈاکٹر صاحب اور اوراد و وظائف کی کثرت والے مسلمان قطعاً نہ تھے، حقیقی معنی میں مسلمان وہی ہے، جو بظاہر خالص دنیا ہی دنیا کے معاملات کو اپنا ایمانی، واقعاتی نظر ونیت سے دین ہی دین بناتا رہے[2]۔

یہ مجسم دنیادار، ڈاکٹر صاحب کی دین دارانہ دنیا داری ہی کا بہت زیادہ معتقد تھا، دنیا کے کم وبیش تمام چھوٹے بڑے معاملات میں ان سے مشورہ لیتا، خصوصاً اس لئے کہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ہدایت یہ بھی کہ کسی دیندار اور سمجھ دار خیر خواہ سے

---

[1] فرشتہ صفت انسان ص ۴۴، ۴۵ [2] ص ۴۵ و ۴۹۔

اپنے معاملات میں مشورہ ضرور کرتے رہا کرو، عام وصایا میں بھی حضرت کے یہ داخل کہ بغیر مشورہ کے کوئی کام نہ کیا جائے، میں نے ایک عریضہ میں عرض کیا کہ میرے مستقل مشیر ڈاکٹر صاحب ہیں تو بہت خوش ہوئے کہا ''ایسا مشیر کس کو ملتا ہے'' شاید ہی کسی امر میں ممدوح مرحوم کے مشورہ ورائے سے ہٹنے کی ضرورت وصورت پیدا ہوئی ہو۔[1]

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب تحریر فرماتے ہیں ''مولانا عبدالباری صاحب نے مولانا تھانوی کے مشورہ سے بھائی صاحب کو اپنا مشیر بھی بنالیا تھا'' [2]

حضرت تھانویؒ کی تصانیف سے مولانا عبدالعلی صاحبؒ کا خاص شغف

کہنا یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جیسے سامع ومخاطب کو پاکر اپنے اس مغلوبانہ حال پر کیسے قابو پا سکتا، ہاں پوری پوری اور طویل طویل مجالست کا موضوع حکیم الامت علیہ الرحمہ کی علمی وعملی، تعلیمی وتربیتی، اصلاحی وتجدیدی دیدہ وخواندہ باتیں رہتیں، بات بات پر ممدوح کے شرح صدر کی کیفیت ومسرت چہرہ سے نمایاں رہتی، کتابیں بھی حضرت کی پڑھتے، دوسروں خصوصاً صاحب زادہ سلمہٗ کو تاکیدی مشورہ دیتے۔[3]

مولانا سید عبدالعلی صاحبؒ پر اعتدال وتوازن کا تھانوی رنگ

ڈاکٹر صاحب پر اعتدال وتوازن پسندی کا خالص تھانوی رنگ زیادہ نکھر کر اس وقت سے آگیا، جب حضرت تھانویؒ کا علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ میں طویل قیام ہوا، اور ڈاکٹر صاحب قریب قریب بلا ناغہ ہی حاضر ہوتے، پھر تو مجلس سے اٹھ کر ایسی باتوں تک کو عین عقل ونقل کے مطابق پاتے، جو بہتوں کے نزدیک دونوں کے خلاف ہوتیں،

[1] فرشتہ صفت انسان ص ۶۲ و ۶۳۔ [2] فرشتہ صفت انسان ص ۴ [3] فرشتہ صفت انسان ص ۷۱۔

ایک دن مجلس میں ایک پروفیسر صاحب نے کوئی ایسا بے ڈھنگا سوال کردیا کہ حضرت کو خاصی ناگواری ہوئی، اور تیز لہجہ میں اس کا اظہار ہوا۔ مجلس سے اٹھ کر سوالیہ انداز میں ڈاکٹر صاحب کی طرف میں نے دیکھا لیجئے حضرت کا سب سے بدنام رنگ بھی آپ نے دیکھ لیا، فرمایا، ایسی بے ڈھنگی باتیں ناگوار کس سلیم الفہم کو نہ ہوں گی، البتہ ہم مخلوق کے دباؤ میں غم کھا کر رہ جاتے ہیں، لیکن حضرت کا ایسا مخلوق سے کمال استغناء تو اس زمانہ میں دیکھنے میں نہیں آیا، پھر کیوں اصلاح وتادیب کا حق نہ ادا فرمائیں۔

اب قدر شناسانہ تھانوی فہم دین کہ وہی صراط مستقیم والا عین دین اسلام ہے، کا مذاق ڈاکٹر صاحب کا اتنا گہرا ہو گیا تھا، کہ تھانویؒ نام ونسبت والوں میں خال خال ہی ملتا ہے[1]

تھانوی ذوق کا اثر

ان کی ادائے حقوق وفرائض میں وفا وآخرت والی ایمانی واحتسابی نظر گھر کی روزمرہ کی معمولی معمولی جزئیات تک پر رہتی، مدتوں اپنا معمول رہا کہ جمعہ ڈاکٹر صاحب کی مسجد میں ہی پڑھتا، اور عصر تک ان کی خاص آرام گاہ میں آرام اور باتیں کرتا رہتا، بارہا الماریوں پر پیاز وغیرہ کی سی چیزیں پھیلی دیکھتا، فرماتے کہ ضرورت کی چیزوں کو وقت پر اور یکجائی طور سے فراہم کر لینے میں سہولت بھی رہتی ہے اور برکت وکفایت بھی، حلال مال بھی بڑی نعمت ہے، اس کی بڑی قدر وحفاظت کرنی چاہیے۔

یہ خاص تھانوی ذوق کی بات تھی، کیا کہوں چھوٹے چھوٹے معاملات تک میں ذمہ داریوں کے ان احساسات کے ساتھ انتظامی مادہ ایسا تھا کہ اگر کسی سلطنت کی انتظامی ذمہ داریاں حوالہ کر دی جاتیں، تو عمرین (عمر بن خطاب وعمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ) کی خلافت کا ایک نظارہ اس حسنی عہد میں دنیا کے سامنے پھر آجاتا'' [2]۔

---

[1] فرشتہ صفت انسان ص ۷۸ از مولانا عبدالباری صاحب ندوی [2] ماخوذ از فرشتہ صفت انسان ۴۸

باب ۲
حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شخصیت
از مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
ماخوذ از نزہۃ الخواطر[1] ۸/ ۶۵

فقیہ جلیل، عالم ربانی، واعظ بے مثال حضرت مولانا اشرف علی بن عبد الحق تھانویؒ جو اپنے کارناموں اور فضائل وخوبیوں کی وجہ سے شہرۂ آفاق رکھتے ہیں، ۵/ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ میں ضلع مظفرنگر کے ایک گاؤں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، مولانا فتح محمد تھانوی اور مولوی منفعت علی دیوبندی سے فنون شرعیہ کی مختصر کتابیں پڑھیں، منطق وفلسفہ و اصول کی اکثر کتابیں اور علم فقہ کی بعض کتابیں مولانا محمود حسن دیوبندی سے پڑھیں، فن ریاضی اور فرائض ومیراث کا علم شیخ سید احمد دہلوی سے حاصل کیا۔ حدیث وتفسیر میں مولانا یعقوب بن مملوک نانوتوی کی شاگردی اختیار کی اور ان تمام علوم کی تحصیل آپ نے دیوبند کے مدرسہ عالیہ میں کی۔

اس کے بعد آپ نے حجاز مقدس کا قصد کیا اور حج وزیارت کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے، سلوک وطریقت میں آپ نے شیخ کبیر امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کا انتخاب فرمایا اور ایک مدت تک ان کی صحبت سے فیض اٹھاتے رہے، پھر ہندوستان لوٹ آئے اور ایک عرصہ تک کان پور کے مدرسہ ''جامع العلوم'' میں تدریسی خدمت انجام دی، ساتھ ہی

---

[1] ترجمہ: از مولانا سلمان نسیم صاحب ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ☆ نزہۃ الخواطر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد ماجد حضرت مولانا سید عبدالحئی صاحبؒ کی تصنیف کردہ ہے، وقت نے وفا نہ کی کتاب کی تکمیل سے پہلے اللہ نے آپ کو بلالیا، حضرت مولانا علی میاں صاحب نے والد ماجد کی طرف سے اسکی تکمیل فرمائی۔

اوراد وظائف میں بھی مشغول رہے یہاں تک کہ آپ پر ایک حال طاری ہوا اور تدریس کو خیر باد کہا اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے سفر پر نکل گئے، اور پھر دوسری مرتبہ حجاز تشریف لے گئے، اور ایک عرصہ تک اپنے شیخ کی صحبت میں رہے پھر ہندوستان واپس تشریف لائے اور صفر ۱۳۱۵ھ سے اپنے وطن تھانہ بھون میں مستقل اقامت اختیار کرلی،

تزکیہ اور اصلاح نفوس میں آپ مرجع خلائق بن چکے تھے، نفس کے تزکیہ و احسان کے پیاسے دور دور سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، اللہ تعالیٰ نے تربیت و ارشاد میں آپ کو اپنے زمانہ کا امام بنایا تھا نفس امارہ کے مکروفریب، شیطان کی چالوں اور حیلوں کو بھانپ لینے کی حس عطا ہوئی تھی، روحانی بیماریوں اور ان کے علاج میں آپ کو خصوصی ملکہ عطا ہوا تھا، جب آپ تھانہ بھون میں مقیم ہوگئے تو پھر کہیں کا سفر نہیں فرمایا، جس کو ملنا ہوتا وہ خود آپ کی خدمت میں حاضری دیتا۔

آپ کی خانقاہ کے اصول و آداب اور استفادہ کے شرائط بڑے سخت تھے، طالبین اصلاح ان سب کو بڑی بشاشت سے قبول کرتے، عام خانقاہوں کی طرح یہاں آنے والوں کی ضیافت کا اہتمام نہیں فرمایا کرتے تھے، لوگ خود اپنا کام کرتے اور اپنے کھانے پینے کا نظم خود کرتے۔ البتہ اہل فضل وکمال اور خاص زائرین کی ضیافت کا انتظام خود فرماتے لیکن ان تمام شرائط کے باوجود دور دراز سے لوگ اپنا روپیہ پیسہ خرچ کرکے آتے اور اپنے خرچ پر آپ کی خانقاہ میں ٹھہرتے۔

آپ کے اوقات بڑے منضبط اور منظّم ہوا کرتے تھے، نظم وضبط اور اوقات کی پابندی میں کسی قسم کی کوتاہی گوارہ نہیں تھی اِلّا یہ کہ کوئی اضطراری حالت ہو۔ جب فجر کی نماز سے فارغ ہوتے تو لکھنے پڑھنے اور تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہوجاتے اور کوئی آدمی آپ کے پاس جانے کی جرأت نہ کرتا یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا تناول فرماتے، پھر قیلولہ فرماتے اور ظہر کی نماز ادا فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد افادہ عام کی غرض

سے بیٹھ جاتے، خطوط کے جوابات تحریر فرماتے، بعض خطوط لوگوں کو پڑھ کر سناتے اور ان سے گفتگو فرماتے اور اپنے خاص نکات ولطائف سے لوگوں کو محظوظ فرماتے، لوگ مانوس ہوتے اور بہت خوش ہوتے۔ آپ کی گفتگو میں عجیب لذت محسوس ہوتی تھی، ذہن فرحت ونشاط محسوس کرتا اور حاضرین اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے، کچھ تعویذات لکھتے، عصر کے بعد لوگوں سے الگ تھلگ رہتے اور اپنے گھر کے امور میں مشغول ہوجاتے یہاں تک کہ عشاء کی نماز پڑھتے اس کے بعد پھر کسی سے ملاقات نہیں فرماتے۔

آپ ان بڑے ربانی علماء میں سے تھے جن کے مواعظ حسنہ اور مولفات سے اللہ تعالیٰ نے بڑا نفع پہنچایا، آپ کے وعظ اور مجلسوں کے ملفوظات رسائل ومجموعوں میں جمع کردیئے گئے ہیں ان کی تعداد ۴۰۰ تک پہنچتی ہے۔ عقیدہ وعمل کی اصلاح میں آپ کی کتابوں اور وعظ کی مجلسوں نے بڑا کام کیا اور بہت نفع پہنچایا، ہزارہا مسلمانوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور بے شمار لوگوں نے بے جا رسم ورواج، جاہلی طور طریقوں اور بدعات وخرافات جو خوشی وغمی اور زندگی کے مختلف موقعوں میں کفار ومبتدعین سے اختلاط کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہوگئے تھے ان سب سے توبہ کی، اسی کے ساتھ ساتھ سلوک وطریقت کی پیچیدگیوں کو آسان اور اس کو لوگوں کے قلب ودماغ سے قریب کیا، مقاصد اور اسباب ووسائل کی اس طرح تنقیح کی جیسے پھل کے چھلکے اور مغز کو الگ کیا جاتا ہے۔

تصوف کے علوم میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا تصنیف وتالیف اور وعظ وتذکیر میں بڑی مہارت حاصل تھی اور آپ کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو عصر حاضر میں دوسرے علماء مشائخ کے حصہ میں نہیں آئی۔ مجھے ان سے ''اصول الشاشی'' کا نصف حصہ علامہ جامی کی ''شرح کافیہ'' کا ایک حصہ اور امام رازی کی ''شرح الشمسیہ'' کا کچھ حصہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

آپ کی بے شمار مفید اور دلچسپ کتابیں ہیں آپ کے بعض اصحاب کی روایت

کے مطابق ان کی تصنیفات کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے جن میں بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی، اجزاء بھی ہیں اور ضخیم جلدیں بھی، ان میں سے ۱۲ کتابیں عربی زبان میں ہیں۔

آپ خوبصورت اور شکیل ووجیہ تھے، رنگ سرخی مائل گورا تھا، قد میانہ تھا، اسراف وتزیین کے بغیر لباس مین نفاست کا خیال رکھتے تھے۔ زبان بڑی شیریں تھی، گفتگو ایسی جیسے مصری کی ڈلی رہنے کا انداز نہایت لطیف ونفیس، آپ کو اللہ تعالیٰ نے وقار ورعب کا پیرہن عطا کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کے مزاج میں مزاح کا عنصر بھی تھا بے شمار چیزیں آپ کو حفظ تھیں اکثر و بیشتر اشعار سے استشہاد فرماتے، مثنوی مولانا روم کے اشعار اپنی مجلسوں اور مواعظ میں برمحل پڑھا کرتے تھے، لوگوں کے حقوق کی ادائیگی اور معاملات کی صفائی کا آپ بڑا اہتمام فرماتے اور اس میں ادنیٰ تساہلی یا غفلت برداشت نہیں فرماتے۔

۱۴/ رجب ۱۳۶۲ھ کو ۸۲ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، اور تھانہ بھون ہی میں مدفون ہوئے۔

مجدد الملت حضرت اقدس تھانویؒ کا مختصر تعارف

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ ہندوستان کے نامور عالم اور عظیم مصلح تھے، تعلیم وتربیت ارشاد وتوجیہ، تزکیہ نفس اور اصلاح احوال میں آپ مرجع خلائق تھے، لوگ اپنے مسائل لے کر آپ کے یہاں حاضر ہوتے اور آپ کے چشمۂ علم وعرفان سے سیراب ہوکر واپس جاتے، دلوں کا روگ اور باطنی امراض لے کر آپ کی خدمت میں پہنچتے اور آپ کے حکیمانہ ارشادات سے شفایاب ہوکر اپنے گھروں کو لوٹتے، ہزار ہا انسانوں کو آپ کے پند ونصائح، مواعظ ومجالس اور کتب ورسائل سے سنت کی پیروی اور شریعت کی اتباع کی توفیق ملی اور جاہلی عادات، مشرکانہ اعتقادات اور

غیر اسلامی رسم ورواج سے جو ہندوؤں سے قدیمی روابط کی بنا پر مسلم معاشرہ میں سرایت کر گئے تھے، اور غم ومسرت کے مواقع پر ان کے مظاہر کثرت سے دیکھنے میں آتے تھے، نجات حاصل ہوئی۔

آپ نے تصوف وطریقت کو عام فہم اور آسان زبان میں پیش کیا، زندگی پر اس کی تطبیق کی اور مقاصد اور وسائل کا فرق واضح کیا، آپ کے چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم ومختصر تصانیف کی تعداد ۸۰۰ تک پہنچتی ہے۔ ۱۶؍رجب ۱۳۶۲ھ میں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا[1]

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مولانا علی میاں صاحبؒ کی نظر میں

(۱) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ علوم دینیہ کے ایک متبحر اور راسخ العلم عالم تھے[2]

(۲) مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، اور باتیں بھی بڑی دلچسپ کرتے تھے اور ایسی تقریر کرتے تھے کہ منھ سے پھول جھڑتے تھے[3]

(۳) دار العلوم دیوبند کے سرپرستوں اور اس سے انتساب رکھنے والے علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ دیوبند میں اگر کوئی پڑھتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ مولانا انور شاہ جیسا محدث اس کو ملا، اور مولانا اشرف علی تھانویؒ حکیم الامت اور شیخ طریقت پیدا کیا۔[4]

(۴) مولانا اشرف علی تھانوی وہ ہیں جنھوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا

---

[1] بصائر، ص:۱۳۱ مصنفہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ [2] پیش لفظ سلوک سلیمانی، ص:۴۲۔

[3] ملک کی نجات ۱۴۰ [4] چراغ زندگی اور دستور العمل ملحقہ خطبات علی میاں، ص ۱۸۵ ج:۶۔

اور اپنے زمانہ کے مطابق ان کو بنایا اور ان کے فائدہ کو عام کیا۔[1]

(۵) ''اصلاح اخلاق'' حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا مجددانہ کارنامہ اور امتیازی وصف ہے، اصلاح معاملات واخلاق اور اصلاح معاشرت واصلاح رسوم وہ عنوان ومیدان ہے جس کے اس دور میں امام ومجدد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔[2]

(۶) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ سے اللہ تعالیٰ نے جو اصلاحی وتجدیدی کام لیا اور جس کا اعتراف اس عہد کے سب صاحب بصیرت اور صاحب انصاف علماء راسخین اور وقت کے مشائخ و مصلحین نے کیا اس کا دائرہ زیادہ تر اخلاق، اصلاح معاملات، تزکیہ نفس اور عمل بالشریعۃ کے دائرہ میں محدود سمجھا جاتا تھا لیکن آپ اپنے مطالعہ، تحقیق وتجربہ اور ذوق کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ اور نفاذ شریعت کے مقصد سے اور حکومت اسلامی کے قیام کی ضرورت واہمیت سے خالی الذہن نہیں تھے۔[3]

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اسم گرامی، احترام وعقیدت کے ساتھ بچپن ہی سے کان میں پڑا ان کی کتاب ''بہشتی زیور'' کا گھر گھر چلن تھا، اور ان خاندانوں میں جو بدعات ورسوم سے دور تھے وہ ایک مفتی اور دینی اتالیق کا کام کرتی تھی، غالباً سب سے پہلے ان کی تصنیفات میں سے اسی کتاب سے تعارف ہوا، خاندان کے ان بزرگوں

[1] نزول قرآن کا مقصد، خطبات علی میاں، ص:۱۹۶ ج:۶۔ [2] پیش لفظ حیات مصلح الامت، از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی [3] مقدمہ اسلامی حکومت ص ۱۳۵۔

اور اہل علم سے جن کے قول کو سند اور جن کی رائے کو فتویٰ سمجھتا تھا، ان کا ذکر ایک حاذق طبیب روحانی اور ایک ماہر معالج امراض نفسانی کی حیثیت سے سنا۔

مولانا تھانویؒ کے متعدد خلفاء ہم لوگوں پر خصوصی شفقت فرماتے تھے اور ان سے مراسم و تعلقات تھے، ان میں مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری اور مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں، والد ماجد کے ایک عزیز شاگرد مولوی افضل علی صاحب تھلواروی جن کو ہم سب لوگ صوفی صاحب کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے مولانا کے مرید اور مجاز بیعت تھے، انہوں نے مولانا سے اس وقت بیعت کی تھی جب شاید چند ہی حضرات کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا وہ مولانا کا تذکرہ برابر کرتے رہتے تھے، مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی سے بھی برابر مولانا کا اور تھانہ بھون کا ذکر خیر سننے میں آتا رہتا تھا، اور اس عقیدت و احترام میں ان دونوں حضرات کی تحریروں اور مجلسوں کو بھی بہت دخل ہے[1]

برادر اکبر مولانا عبدالعلی صاحبؒ کی طرف سے تھانہ بھون حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضری کی ہدایت

۱۹۳۴ء کی گرمیوں میں میں مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں لاہور میں تھا کہ بھائی صاحب نے جو میری دینی و اخلاقی تربیت کے لئے کوشاں رہتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ واپسی میں تھانہ بھون حاضری دیتا ہوا اور مولانا کی خدمت میں کچھ دن قیام کر کے واپس ہوں، ان کو تھانہ بھون کے آداب اور حاضری کے قواعد و ضوابط کا بھی علم تھا، اس لئے انہوں نے میری رہنمائی فرمائی اور ہدایت کی کہ میں خط میں اپنا تعارف بھی کرادوں

---

[1] پرانے چراغ ص ۱۱۹۔

اور سفر کا مقصد اور مدت قیام بھی لکھدوں، نیز جن حضرات سے مجھے تلمذ یا استرشاد کا تعلق ہے ان کے ناموں کی وضاحت بھی کردوں، اس لئے کہ مولانا اس صفائی اور اظہار کو بہت پسند فرماتے تھے، اور اخفا و توریہ اور تکلفات سے ان کو اذیت ہوتی تھی میں نے ان ہدایات پر پورا عمل کیا اور لاہور سے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا جس میں اپنا تعارف بھی کرایا، مجھے معلوم تھا کہ حضرت میرے والد ماجد سے اچھی طرح واقف ہیں، اپنے اساتذہ اور جن حضرات سے بیعت و تربیت کا تعلق تھا ان کا بھی تذکرہ کیا، ندوہ اور مولانا مدنی سے انتساب و تعلق کا بھی اظہار کیا یہ بھی لکھا کہ ایک ہفتہ قیام کی نیت ہے اور مقصد بھی زیارت و شرف ملاقات ہے، مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ .... اس خط کا جواب عنایت فرمایا:

حسب معمول خط کے حاشیہ پر مختلف فقروں اور مندرجات کے مختصر جواب تحریر فرمایا، حاضری کی اجازت طلبی پر تحریر فرمایا کہ ''سر آنکھ پر تشریف لائیں، لیکن صرف ملاقات کی نیت سے، نہ اعتقاداً نہ انتقاداً ظاہراً'' میں نے جن بزرگوں سے اپنے تعلق کا اظہار کیا تھا، اس پر تحریر فرمایا کہ ''صفائی سے دل خوش ہوا'' پھر بعض بزرگوں کے طرز سے خود بھی اپنے اختلاف کا ذکر کیا، حاضری کی اجازت طلب کرنے پر دوبارہ ارشاد ہوا کہ ''میرے لئے فخر ہے، اگر میرے حالات اس فخر میں مانع نہ ہوں، ورنہ مشتاقی نہ کہ ملولی'' (**کما قال السعدی**)

اس وقت تک بھائی صاحب کی بھی ملاقات مولانا سے نہیں ہوئی تھی، مولانا ان کا تذکرہ غائبانہ سنتے رہتے تھے، لیکن میرے نام سے بھی غالباً واقف نہ تھے، اور کوئی وجہ بھی اس واقفیت کی نہ تھی، اس لئے آخر میں مستقل یہ دلچسپ عبارت تحریر فرمائی کہ ''مکرمی دام لطفکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اتنی تکلیف اور دیتا ہوں کہ کیا آپ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی ہیں، یا آپ ہی کے دو نام ہیں'' اس سرفراز نامہ کا جواب میں نے لاہور ہی سے طالب علمانہ انداز میں دیا اور بلا ضرورت یہ تحریر کیا کہ میرے نزدیک یہ اختلاف باپ چچا کے اختلاف کی طرح ہے کہ ایک سعادت مند کے لئے صلۂ رحم تعلق سے مانع

نہیں، گویا اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اور اس اختلاف کی اہمیت کو کم کرنے کے لئے استدلال اور حجت سے کام لیا، مولانا کی طبیعت کی نزاکت اور ذکاوت کے جو قصے مشہور تھے، اور جو واقعات تھانہ بھون کے منتسبین اور آنے جانے والوں کی زبانی سنے تھے، ان کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ ایک نوعمر اور کم علم طالب علم کی جسارت اور دخل در معقولات، طبیعت پر بہت گراں گذرے گا، اور اس عریضہ کا جواب یہ آئے گا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت نہ فرمائیں، آپ کو کوئی نفع نہ ہوگا، غالباً اس خط کے لکھنے کے بعد میرا قیام لاہور زیادہ نہیں رہا، اور میں جلد لکھنؤ واپس ہوگیا، شاید اس اندیشہ سے کہ اس خط کا جواب نہیں آئے گا یا اپنی بے خیالی اور ضوابط کی ناواقفیت سے میں نے اس میں جوابی کارڈ نہ رکھا لیکن میری حیرت ومسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، جب مولانا نے اس عریضہ کے جواب کے لئے خلاف معمول اہتمام فرمایا اور تمام ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر خود لفافہ بنایا، اس پر اپنے دست مبارک سے لکھنؤ کا پتہ لکھا اور مستقل ایک مکتوب لکھ کر اس کے اندر رکھا اور مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی مالک انوار المطابع کو جو لکھنؤ آرہے تھے حوالہ فرمایا کہ مجھے پہنچادیں، پہلے پتہ کی عبارت پڑھئے پھر مکتوب ملاحظہ کیجئے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحبؒ کا خط مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نام

پتہ کی عبارت: مشفق مکرم مولوی علی ابوالحسن صاحب سلمہٗ

بتوسط جناب ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب سلمہٗ

۳۷ امین آباد لکھنؤ مرسلہ اشرف علی از تھانہ بھون

از اشرف علی عفی عنہ، بخدمت مجمع الکمالات زید لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فرحت نامہ پہونچا، ہر ہر حرف حیات بخش تھا، جزاکم اللہ تعالی ہذہ المحبۃ آپ کے صدق وخلوص وسلامت فہم کے اثر سے میری طبیعت بھی دفعۃً آپ سے بے تکلف ہوگئی، اس لئے آپ سے کسی امر کا اخفا نہیں چاہتا، اس کے تحت میں اتنا اور عرض کرنے کی ہمت کرتا ہوں کہ......کا اختلاف اس وقت تک آپ کو علمی اور اجمالی ہی معلوم ہے، کیوں کہ ان کو دیکھا ہے، مجھ کو نہیں دیکھا، مجھ کو دیکھنے کے بعد اس اختلاف کا علم تفصیلی ہوگا اور علم سے متجاوز ہو کر جذبات واخلاق کے متعلق بھی، اس وقت مجھ کو قوی توقع ہے کہ میرے ساتھ جو حسن ظن ہے، اس بار سے قلب ہلکا ہو جائے گا، جس سے راحت ہوگی، والغیب عنداللہ۔

حضرت خلیفہ صاحب کے پیام وسلام سے ان کی یاد تازہ ہوگئی، اللہ تعالی ان کے برکات میں تضاعف فرمائے، باقی آپ کے لئے دعا کرتا ہوں اور دعا چاہتا ہوں [1]۔

جس کا صیغہ مدت دراز سے یہ تجویز کر رکھا ہے۔"**اللھم کن لنا واجعلنا لک**" والسلام۔

اس گرامی نامہ پر ۱۶/ربیع الاول ۱۳۵۳ھ کی تاریخ ہے، جو ۱۴/جون ۱۹۳۴ء کے مطابق ہے، اس شفقت نامہ پر اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ۔

"کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید"

لیکن اس کے بعد بھی تھانہ بھون حاضری کی نوبت نہیں آئی، یہاں تک کہ تھانہ بھون خود لکھنؤ آ گیا۔

---

[1] خاکسار نے اپنے عریضہ میں مولانا سے دعا کی درخواست کی تھی اور کسی خاص مقصد کا تعین نہیں کیا تھا، بلکہ لکھا تھا کہ "**اھل مکۃ ادری بشعابھا**" (مکہ کے باشندے اس کی گلیوں سے خوب واقف ہیں)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی لکھنؤ

بغرض علاج تشریف آوری

اگست ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں مژدۂ جانفزا سننے میں آیا کہ حضرت بغرض علاج لکھنؤ تشریف لارہے ہیں، کوئی نہیں جانتا تھا کہ اپنے اس علاج کے پردہ میں کتنے بیماروں کا علاج ہونے والا ہے، اور شہر کے ایک مرکزی مقام (مولوی گنج) میں ایک مولوی (مدرسہ کا اصطلاحی مولوی نہیں بلکہ جس معنی میں مولانا جامی نے مولانا روم کے متعلق کہا تھا ''مثنوی مولوی معنوی'' اور کسی عارف نے کہا تھا ''مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم'') روحانی مطب کھولنے والا ہے، جس کے حاضر باشوں میں بڑے بڑے علماء ومشائخ اور عمائد شہر ہوں گے، غرض اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا لکھنؤ تشریف لائے، اپنے قدیم مسترشد اور مجاز صحبت مولوی محمد حسن کاکوروی مالک انوار المطابع اور نبیرہ مولانا محسن کاکوروی کے مکان پر قیام فرمایا، علاج شفاء الملک حکیم عبد الحمید (جھوائی ٹولہ) لکھنؤ کا تھا، قیام پورے چالیس دن رہا، وہ مدت جس کو یوں بھی سلوک وتربیت اور خانقاہوں کے نظام سے خاص مناسبت ہے، ظہر اور عصر کے درمیان مخصوص لوگوں کو حاضری کی اجازت تھی، ضابطہ یہ تھا کہ یا تو مولانا ذاتی طور پر آنے والوں سے واقف ہوں، یا حاضرین مجلس میں سے کوئی معتبر آدمی اس سے واقف ہو، تاکہ کوئی نامناسب اور اذیت پہنچانے والی بات پیش نہ آئے[1]

---

[1] پرانے چراغ، :۱۲۴۔

لکھنؤ میں حضرت اقدس حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی علمی واصلاحی مجالس اور کبار علماء کی شرکت

مولانا کی اس غیر متوقع آمد کی خبر تمام احتیاطوں کے باوجود بجلی کی طرح تمام اطراف واکناف بالخصوص مشرقی اضلاع میں پہنچ گئی، جو مدت دراز سے آپ کی آمد سے محروم ومایوس تھے، خاص ضوابط وشرائط کے ساتھ اہل تعلق کو آنے کی اجازت دی گئی اور خلفاء ومسترشدین کلکتہ سے، امرتسر ولاہور تک کے مختلف وقتوں میں حاضر ہوتے رہے، عمائد شہر کی بھی ایک تعداد زیارت سے مشرف اور مجالس سے مستفید ہوئی ان میں علماء فرنگی محل، اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلماء اور شہر سے دینی ذوق رکھنے والے رؤساء وعمائد بھی تھے، مولانا عصر کی نماز مسجد خواص میں جو آپ کی تشریف آوری اور روزانہ کی مجالس کی وجہ سے حقیقی معنی میں مسجد خواص بن گئی تھی، ادا فرماتے تھے، نماز کے بعد مسجد کے شمالی مغربی گوشہ میں مجلس ہوتی، مولانا خطوط کے جوابات بھی دیتے رہتے اور لوگوں سے مخاطب بھی ہوتے، اس مجلس میں سلوک وتصوف کے نکات، اصلاحی وعلمی تحقیقات اور بزرگوں کے حالات وواقعات ارشاد فرماتے، بزرگوں کے واقعات بیان کرتے وقت خاص کیف واثر محسوس ہوتا، اس وقت چیدہ چیدہ لوگ ہوتے، اور مولانا کو بھی بڑا انبساط وانشراح ہوتا، بھائی صاحب مرحوم اس مجلس میں نیز عصر سے بیشتر کی مجلس میں جو قیام گاہ پر ہوتی بڑی پابندی سے شرکت کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی طالب علم مدرسہ میں حاضری کی پابندی کر رہا ہے، مولانا بھی خصوصی شفقت والتفات فرماتے، علاج کے بارے میں بھی کبھی کبھی مشورہ میں شریک کرتے۔

حضرت مولانا کا حضرت تھانویؒ سے خاص ربط اور علمی خدمت

یہ ناچیز بھی تقریباً روزانہ ہی بھائی صاحب کے ساتھ حاضری دیتا، اس عاجز کی طرف مولانا کی خصوصی توجہ کا ایک محرک یہ پیدا ہوا کہ اسی زمانہ میں ''القول المشور'' کی طباعت ہورہی تھی، جو اصلاً مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ کی تصنیف ہے، لیکن اس میں مولانا کی تحقیقات واضافے بھی ہیں، مولانا کو اس کی طباعت واشاعت کا بڑا اہتمام تھا، اس میں بکثرت طویل عربی کی عبارتیں بھی آئی ہیں، خدا وصل صاحب بلگرامی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کی تصحیح کا کام میرے سپرد کر دیا، مجھے اس میں جہاں اشکال ومراجعت کی ضرورت پیش آتی عصر کے پیشتر کی مجلس میں مولانا کے سامنے پیش کرتا اور مولانا اس کو حل فرمادیتے۔

حضرت مولاناؒ کے مکان پر حضرت تھانویؒ کی تشریف آوری

اس دوران قیام میں ۱۵؍ستمبر ۱۹۳۸ء کو اچانک بھائی صاحب سے ان کے مکان پر آنے کی خواہش کا اظہار فرمایا، اس سے زیادہ عزت ومسرت کی بات کیا ہوسکتی تھی، مولانا رفقاء وخدام کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ مکان پر تشریف لائے، دیر تک سرفراز فرمایا، حضرت حاجی صاحب اور بزرگوں کے حالات کا سلسلہ وہاں بھی شروع ہوگیا[1]

اگست ۱۹۳۸ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بغرض علاج لکھنؤ تشریف لائے اور چالیس ۴۰ روز قیام فرمایا، یہ نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ دور ونزدیک کے اضلاع کے لئے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ تھی کہ مولانا عرصہ سے سفر ترک فرماچکے تھے

[1] پرانے چراغ، :۱۲۴۔

اور طالبین ومخلصین کے لئے تھانہ بھون جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مگر اب کنواں خود پیاسوں کے پاس آ گیا تھا، اور معالج روحانی وجسمانی علاج کے لئے مریضوں کے پاس بھیج دیا گیا تھا، بھائی صاحب مرحوم نے جو ایسے مواقع کی قدر و قیمت خوب جانتے تھے، اور خاندانی طور پر مولانا کے معتقد اور ان کے کمال کے قائل تھے ایک طالب علم کی طرح اس ''مدرسہ'' میں جو بعد ظہر مولوی محمد حسن صاحب (مالک انوار المطابع لکھنؤ) کے مکان اور بعد عصر ''مسجد خواص'' میں لگتا تھا، حاضری دینی شروع کی، مجھے بھی وہ التزاماً اپنے ساتھ لے جاتے تھے، قسمت سے اس وقت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی کا رسالہ ''القول المنصور'' زیر طبع تھا اور مولانا کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں طویل طویل عربی کی عبارتیں تھیں، وصل بلگرامی صاحب نے تصحیح ومقابلہ کا کام میرے سپرد کر دیا، اس تقریب سے مولانا سے اور قرب وحضوری کا موقعہ ملا، ۱۵ر ستمبر ۳۸ء کو مولانا اپنی خواہش سے ''مسجد خواص'' سے پیدل چل کر ہمارے مکان پر تشریف لائے اور بھائی صاحب کے مطب میں تھوڑی دیر تشریف رکھ کر اس خصوصیت کا اظہار فرمایا، جو سارے علماء ومشائخ دیو بند کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے رہی ہے۔[1]

اگست ۱۹۳۸ء میں جب حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ تشریف لائے اور ایک پورا چلہ یہاں قیام فرمایا تو ڈاکٹر صاحب کا روزانہ کا معمول تھا کہ نماز عصر سے پیشتر آپ کی قیام گاہ پر حاضر ہوتے اور مجلس میں شریک ہوتے، پھر نماز عصر کے بعد مسجد خواص کی مجلس میں شرکت کرتے اور نماز مغرب کے بعد واپس آتے۔

مولانا نے اپنی علالت کی وجہ سے شہر میں کسی کی دعوت قبول نہیں فرمائی اور نہ کہیں تشریف لے گئے، لیکن جب روانگی میں دو روز باقی تھے، (۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء) تو اچانک عمومی مجلس میں ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ میرا آپ کے گھر پر آنے کا جی چاہتا ہے،

---

[1] کاروان زندگی، ص: ۱۷۰۔

اور میں مغرب بعد چلوں گا، چنانچہ مسجد خواص سے نکل کر پیدل ڈاکٹر صاحب کے مطب میں تشریف لائے اور تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھ کر واپس تشریف لے گئے، اس کے بعد اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اور ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام فرمایا اس زمانہ میں بھی ڈاکٹر صاحب برابر حاضری دیتے رہے اور پابندی سے مجالس میں شرکت کی۔[1]

تین برس کے بعد دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں پھر لکھنؤ تشریف آوری ہوئی اس مرتبہ بھی ایک مہینہ سے کچھ زیادہ قیام رہا، تقریباً وہی معمولات ونظام الاوقات رہا، اس طرح پھر ان روح اور پر کیف مجالس میں شرکت اور استفادہ کا موقع ملا۔[2]

پر رونق مجلس کی کچھ تفصیل حضرت مولانا محمد ثانی حسنی صاحبؒ کے قلم سے

ستمبر ۱۹۳۸ء کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ لکھنؤ بغرض علاج تشریف لائے اور مولوی گنج میں مولانا محمد حسن صاحب کے مکان میں قیام کیا، مولانا کے قیام کی وجہ سے ہندوستان بھر کے علماء ومشائخ حاضر حدمت ہوتے، بعد ظہر مکان پر خواص کی مجلس ہوتی اور بعد عصر مسجد خواص میں عام مجلس منعقد ہوتی، خواص کی مجلس میں ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب اور ان کے بھائی مولانا سید ابوالحسن علی صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے، خدا کے فضل وکرم سے انہیں مجالس میں سے ایک مجلس میں ان ہر دو بزرگوں کے ساتھ ہم لوگ بھیڑی منڈی مولوی گنج پہونچے تو زائرین کی بڑی تعداد سڑک پر اور سڑک کے کنارے کھڑی تھی اور اندر جانے کی اجازت کی منتظر، ڈاکٹر صاحب نے اطلاع کرائی، دروازے پر مفتی جمیل احمد صاحب تھانویؒ کھڑے تھے، انہوں نے حضرت تھانویؒ کے پوچھنے پر پوچھا آپ کے ساتھ کون کون ہے؟ جواب دیا میرے بھائی

---

[1] الفصل للوصل، ص:۱۵۳، حیات عبد الحیؒ ضمیمہ، ص:۳۸۲ [2] پرانے چراغ ص ۱۲۴۔

ابوالحسن علی اور میرے بھانجے محمد ثانی، اندر سے اجازت ملی ہم لوگ داخل ہوئے اس وقت حضرت خطوط سن رہے تھے اور جوابات لکھوار ہے تھے۔

۱۵ر ستمبر ۱۹۳۸ء مطابق ۱۹ر رجب ۱۳۵۷ھ کو خواص کی مجلس میں حضرت مولانا نے ڈاکٹر صاحب سے ازخود فرمایا! ڈاکٹر صاحب میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کے گھر آؤں انشاءاللہ آج ہی بعد مغرب آؤں گا، پھر حسب ارشاد خواص کی مسجد میں بعد عصر مجلس کر کے اور نماز مغرب پڑھ کر پاپیادہ گوئن روڈ تشریف لے چلے لوگ سن کر پیچھے پیچھے چلنے لگے، حضرت مولانا ڈاکٹر صاحب کے مطب میں کچھ دیر بیٹھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بصد شوق وذوق اپنے بھتیجے محمد میاں کو جن کی عمر تین سال کی تھی گود میں کوٹھے سے لائے حضرت تھانویؒ نے محمد میاں کو اپنی آغوش میں لیا، سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں، مطب اور مطب کے سامنے شائقین، عوام، خواص کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا تھا، تھوڑی دیر بعد یہ نورانی مجلس ختم ہوئی اور حضرت اپنی قیام گاہ کو تشریف لے گئے، حضرت تھانویؒ کی تشریف بری سے اس گھر کو جو شرف اور اس کی وجہ سے اہل خانہ کو جو کیف وسرور حاصل ہوا تھا وہ مدتوں باقی رہا اور آج بھی اس کی لذت اور نورانیت محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۳۹ء میں جب کہ محمد میاں کی عمر ۴ سال کی تھی گھر میں تعلیم کے لئے بٹھائے گئے اور اپنی بہنوں کے ساتھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے مگر قاعدے سے ۱۹۴۱ء میں جبکہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ دوبارہ لکھنؤ تشریف لائے اور تقریباً ایک ماہ قیام فرمایا تو کسی تاریخ کو بعد ظہر خواص کی مجلس میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی محمد میاں کو لے گئے، حضرت نے پاس بلایا اور بسم اللہ کرائی، محمد میاں کے ساتھ حضرت تھانویؒ کے ایک مسترشد مولوی عبداللہ صاحب کشمیری کے لڑکے عبیدالرحمٰن بھی تھے۔ ان دونوں نے پڑھا، محمد میاں نے آہستہ آواز میں پڑھا، اور عبیدالرحمٰن نے بلند آواز میں حضرت تھانویؒ نے محمد میاں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ بچہ نقشبندی ہوگا اور عبیدالرحمٰن کو

فرمایا کہ یہ چشتی ہوگا۔ بسم اللہ کی یہ مجلس بڑی بارونق اور نورانی تھی۔ ہر طرف علماء فضلا اور اہل اللہ موجود تھے۔ محمد میاں اپنی کم عمری کے دور کے یہ دونوں واقعوں کو اپنی علمی اور دینی زندگی کی ترقیات کا منبع سمجھتے تھے اور اس ابتدا پر بڑا کیف وسرور اور اپنی خوش بختی محسوس کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کو حضرت تھانویؒ سے بہت زیادہ تعلق تھا اور ان کے دل میں حضرت مولانا کی عظمت اور محبت بلکہ کسی درجہ کا عشق کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اور اکثر ان کی تصانیف پڑھا کرتے تھے اور ان سے بڑا فائدہ اٹھاتے تھے[1]

حیات عبدالحیٔ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے سفر لکھنؤ کی بابت تحریر فرماتے ہیں کہ "الفصل للوصل" میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے[2]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موقع کی مناسبت سے وہ تفصیل یہاں بھی درج کردی جائے، وھو ھذا.

لکھنؤ سفر کی تفصیل

جناب وصل بلگرامی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

حضرت والا کے اعزہ کا خیال تھا کہ تھانہ بھون سے کسی دوسری جگہ لے جا کر تشخیص اور علاج ہونا چاہیے، کوئی سہارنپور لے جانے کی رائے دیتا ہے، اور حکیم صاحب، نیز بہت سے لوگ میرٹھ لے جانے کے لئے عرض کر رہے تھے، حضرت والا کی طبیعت کا رجحان بھی میرٹھ کی طرف تھا، مگر خدام نے جب کل حالات معلوم کر لئے اور میرٹھ یا سہارنپور لے جانے کے ارادے سے واقف بھی ہوگئے، تو سب نے یکجا ہوکر ہر پہلو پر نظر کر کے تبادلۂ خیال کیا، بالاتفاق یہ طے ہوا کہ میرٹھ یا سہارنپور لے جانا مناسب نہیں ہے،

---

[1] تعمیر حیات خصوصی شمارہ مولانا محمد الحسنی نمبر ص ۱۸۳ [2] حیات عبدالحیٔ، ص: ۳۸۲۔

وہاں نہ کوئی معروف ومشہور ڈاکٹر ہے، نہ خاص صاحبِ کمال طبیب، اس کے بعد دوسرے مقامات کے نام لئے گئے۔

آخر متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ لکھنؤ لے جانا چاہئے، وہاں میڈیکل کالج بھی ہے، ہر طرح کے ماہر اور کامل فن ڈاکٹر موجود ہیں، ہر قسم کے آلات دستیاب ہوسکتے ہیں، اطباء کا لکھنؤ مخزن ہے، نہایت نامور حاذق اور استادِ فن اطباء وہاں ہیں، وہ لوگ بلڈ پریشر اور اس کے علاج سے بھی واقف ہیں، اس کے علاوہ وہاں ایسے جاں نثار خدام بھی موجود ہیں جن کی وجہ سے کسی قسم کی تکلیف حضرت والا کو ہو ہی نہیں سکتی، اس باہمی تجویز کے بعد سب اہل شوریٰ حضرت اقدس کی خدمت عالی میں حاضر ہوئے، جن میں جناب مولوی شبیر علی صاحب، جناب مولوی محمد عیسیٰ صاحب، جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، جناب مولوی محمد حسن صاحب امرتسری، جناب مولوی عبد الباری صاحب ندوی، مولوی عبد الحمید صاحب تحصلیدار پنشنر، مولوی محمد حسن صاحب مالک انوار بکڈ پو لکھنؤ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ان حضرات کے ساتھ یہ خادم وصل بھی شریک تھا، غرض حضرت والا سے اس مشورے اور رائے کا اظہار نہایت ادب کے ساتھ کیا گیا، حضرت والا نے کمال شفقت سے ان امور پر غور فرماتے ہوئے کہ لکھنؤ میں میڈیکل کالج اور طبیہ کالج موجود ہیں، ڈاکٹری اور یونانی دونوں علاج آسانی سے ہوسکتے ہیں، اور اپنے خدام لکھنؤ کی وجہ سے ہر قسم کی آسانی وہاں ممکن ہے، منظور فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ میرے ساتھ دونوں گھر میں اور دوسرے متعلقین بھی ہوں گے، تاکہ کافی آرام مل سکے[1]

شہر لکھنؤ کی سعادت

لکھنؤ کا سفر جو صرف معالجے کی غرض سے ہوا، مختلف وجوہ سے حضرت والا کے سوانح حیات میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اولاً اس وجہ سے کہ گزشتہ پندرہ سال کے طویل

---

[1] الفصل للوصل، ص: ۹۷ تا ۹۹

عرصے میں اول تو کہیں سفر ہی نہیں فرمایا، اور جو تین سفر اتفاقیہ ہوئے بھی ان میں کسی جگہ اتنا قیام نہیں فرمایا، سہارنپور کے دو سفر تو ہم روزہ واپسی پر مشتمل تھے، اور لاہور میں کم وبیش صرف دو ہفتہ قیام ہوا تھا۔

یہ فخر لکھنؤ ہی کو حاصل ہے کہ وہاں تقریباً ڈیڑھ ماہ تک انوار وبرکات کی بارشیں ہوتی رہیں، دوسرے اس وجہ سے کہ حضرت والا نے تمام اہل شوریٰ کی رائے کے ساتھ دوسرے مقامات کے مقابلے میں معالجے کے لئے لکھنؤ ہی کو پسند ومنتخب فرمایا، اور سخت علالت کی حالت میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ پر اعتماد کیا گیا، تیسرے اس وجہ سے کہ لکھنؤ کی آب وہوا حضرت والا کے مزاج اقدس کے موافق آئی، لکھنؤ میں پہنچتے ہی بغیر کسی دوا کے استعمال کے طبع مبارک میں تقریباً وہ نشاط، شگفتگی اور بشاشت نمودار ہونے لگی جو حالت صحت میں رہتی تھی، چوتھے اس وجہ سے کہ گو اس کے قبل بھی حضرت کے اقدام میمنت التیام نے سرزمین لکھنؤ کو شرف واعزاز بخشا ہے، لیکن خدام کے علاوہ عقیدت مند حضرات پر انس ومحبت کی ارزانی فرمائی گئی ہے، اس سے قبل اس کا عشر عشیر بھی اثر نہ تھا، حتیٰ کہ کانپور جو طویل قیام کی وجہ سے یک گونہ حضرت والا کے وطن سے مالوف ہی کی حیثیت رکھتا ہے، اس خاص توجہ اور مورد محبت ہونے میں لکھنؤ سے کہیں پیچھے رہ گیا، **فکفی به، فخرا او افتخارا، او مباهاة و ابتهاجا** اور سب سے زیادہ فخر کی بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے لکھنؤ ہی میں صحت کاملہ عطا فرمائی، اور اس سخت مرض اور خطرے سے نجات بخشی، جس کی وجہ سے ہر شخص پریشان ہو رہا تھا، حضرت والا بار بار فرماتے ہیں:

’’میں نے مجبوریوں کی وجہ سے اہل لکھنؤ سے بے اعتنائی کی، ملاقات میں پابندیاں عائد کردیں، ظاہراً سختی کا برتاؤ کیا، مصافحے تک کی اجازت نہیں دی، اس پر بھی ان حضرات نے جس محبت اور خلوص کا برتاؤ میرے ساتھ کیا ہے، اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا، اور اب اکثر لکھنؤ یاد آتا ہے۔‘‘ [1]

---

[1] الفصل للوصل، سفرنامہ لکھنؤ ص: ۸۲ تا ۸۳۔

زائرین کی کثرت

حضرت والا کی تشریف آوری کی خبر سن کر پہلے ہی روز سے مجمع کی کثرت ہونے لگی، حضرت والا کی طبع مبارک اس کی متحمل نہیں تھی، اور جناب شفاء الملک صاحب نے نیز دیگر اطباء نے ملاقات کی ممانعت کردی تھی، لیکن حضرت والا نے ان کی اجازت سے اتنی ترمیم فرمادی تھی کہ جن سے بے تکلفی ہے وہ اپنی اطلاع کردیں، اگر میری طبیعت چاہے گی، بلالوں گا، ورنہ معذرت کردوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوتا رہا، مگر مجمع نے اس قدر پریشان کیا کہ مجبور ہوکر حضرت والا کو حسب ذیل اعلان لگانا پڑا۔

اعلان ضروری

بخدمت ناظرینِ اعلان السلام علیکم

میرا یہ سفر، علالت کے سبب، معالجہ وراحت کی غرض سے ہوا ہے، میری موجودہ حالت ضعف میں اطباء اور ڈاکٹروں نے باتفاق زیادہ ملاقات کرنے اور زیادہ بات چیت کرنے سے بتاکید منع کیا ہے، اور میں خود بھی طبیعت میں اس کا تحمل نہیں پاتا، البتہ قلیل کی اجازت دی ہے، اور اس قلیل وکثیر کی تفریق اپنی طبیعت کے رنگ سے میں خود ہی کرسکتا ہوں سو میں نے یہ تجویز کی ہے کہ جن صاحبوں کے ساتھ پہلے سے تعلقات کے خصوصیات ہیں، ان سے ملاقات اور بات چیت کروں گا، بقیہ حضرات سے عذر کردوں گا، اس لئے میں نے عام ملاقات بالکل بند کردی ہے، اور سب حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ جن حضرات سے ملاقات سے عذر کردیا جائے وہ بار بار درخواست کرکے دروازے پر کھڑے رہ کر میری مجلس کو پریشان نہ کریں کہ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے اور یہ امر محبت کے خلاف ہے، اس اعلان کے ذریعہ سے اس کی اطلاع کرتا ہوں[1]

[1] اشرف علی تھانوی، بقلم خود۔

یہ اعلان عالی پنجشنبہ ۱۷/اگست ۱۹۳۸ء کو چسپاں کیا گیا تھا اس اعلان کے بعد بھی دروازے پر مشتاقین اور زائرین کا مجمع برابر بڑھتا رہا، لوگ اعلان پڑھتے تھے کچھ بگڑتے تھے، کچھ خفا ہوتے تھے اور کچھ صبر سے کام لیتے تھے اور مایوس ہو کر چلے جاتے تھے۔

حضرت والا نے مخصوصین کو اجازت دے دی تھی، لیکن وقت کی کوئی تعیین نہیں تھی، ایسا مجمع قیام گاہ کے باہر صبح نو بجے سے گیارہ بجے تک اور پھر پانچ بجے سہ پہر سے گھنٹہ بھر برابر رہتا، ان اوقات میں جب حضرت والا کے مزاج اقدس میں آتا، بلا لیتے ورنہ سب نہایت خاموشی کے ساتھ حضرت والا کی مرضی عالی کو مقدم سمجھ کر واپس چلے جاتے کبھی ایسا ہوتا تھا کہ دن بھر میں تین بار مجلس ہوتی، کبھی دو بار اور کبھی ایک بار، اور کسی دن ایسا بھی ہوا کہ کسی وقت بھی مجلس نہیں ہوئی۔

حضرت والا کے تشریف لانے کے بعد دو تین دن تک تو جناب مولوی شبیر علی صاحب اور بھائی نصیر احمد صاحب اسی مقام کے بالا خانے پر مقیم رہے لیکن جب دیکھا گیا کہ لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا ہے، ہر شخص چاہتا ہے کوئی ایسا ہو جس سے کچھ پوچھ سکوں، نیز باہر سے آنے والے خدام کے قیام کی کوئی جگہ نہ تھی، لہذا مولوی محمد حسن صاحب نے دوسرا بالا خانہ اس مکان سے قریب لب سڑک کرایہ پر لے لیا، اور جناب مولوی شبیر علی صاحب اور بھائی نصیر احمد صاحب اس میں منتقل ہو گئے، حضرت والا کے ساتھ صرف مولوی جمیل احمد صاحب رہ گئے اور پہلا بالا خانہ تنہا مولوی جمیل احمد صاحب کے قبضے میں آ گیا، جب حضرت والا کے مزاج کی حالت قابل اطمینان ہوگئی تو جناب مولوی شبیر عل صاحب مع بھائی نصیر احمد صاحب کے ۲۳/اگست ۱۹۳۸ء کو تھانہ بھون واپس تشریف لے گئے۔

حضرت والا اپنے ملازمین کو مکانوں کی نگرانی کے لئے تھانہ بھون ہی میں چھوڑ آئے تھے اور حاجی عبدالستار صاحب متوطن موضع بکھرا ضلع اعظم گڑھ کو جو اکثر حضرت والا کی ضرورت کے وقت نہایت خلوص محبت اور تندہی سے خدمت کیا کرتے ہیں بلا لیا تھا،

جو حضرت والا کے لکھنؤ کے زمانۂ قیام تک برابر مصروف خدمت رہے۔

اس سفر اور قیام لکھنو میں باستثنائے بعض ایام جن میں طبیعت بے حد ضعیف تھی، حضرت والا کے کسی معمول میں فرق نہیں آیا، بجز اس کے کہ ہر نماز مسجد میں باجماعت ادا نہ ہو سکی مگر جمعہ اور کچھ دن کے بعد عصر و مغرب کی نماز برابر مسجد خواص میں ادا فرماتے رہے۔

جناب حکیم شفاء الملک صاحب روزانہ آٹھ اور نو بجے صبح کے درمیان تشریف لاتے تھے اور مزاج اقدس کی کیفیت دریافت کر کے جو ضروری ہدایت دینا ہوتی تھی، دے کر تشریف لے جاتے تھے۔

مسجد خواص میں عصر سے مغرب تک قیام

جب حضرت والا کو کچھ قوت آ گئی، تو یہ معمول فرمایا کہ مسجد خواص میں عصر کی نماز کے وقت جاتے اور نماز مغرب پڑھ کر واپس تشریف لاتے تھے، پہلے دن حضرت والا مسجد خواص میں جب تشریف لے گئے ہیں اس وقت مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، حاضرین سے عرض کر دیا گیا تھا کہ مصافحے کی زحمت نہ فرمائیں کیوں کہ اس سے بجائے راحت کے تکلیف ہوتی ہے، لیکن مغرب کے بعد جب حضرت والا قیام گاہ پر تشریف لانے لگے تو لوگ چاروں طرف کھڑے ہو گئے، حضرت والا کو بہت تکلیف ہوئی، اور فرمایا کہ اگر آپ حضرات کا یہی حال ہے تو کل سے میں نہیں آؤں گا، لیکن الحمد للہ یہ مجمع اہل محبت اور اصحاب فہم کا تھا، دوسرے دن سے حضرت والا کی خواہش گرامی کے مطابق تمام حضرات نے عمل کیا، نہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے نہ واپسی کے وقت چاروں طرف کھڑے ہو کر مجمع کیا نہ کسی قسم کا تکلف کیا اور نہ کسی قسم کی تکلیف دی، حضرت والا کے قلب مبارک پر اصحاب لکھنؤ کی محبت، ان کے خلوص اور ان کی فہم و فراست کا خاص اثر ہوا، اور متعدد بار اس کا اظہار فرمایا۔

مسجد خواص میں مجلس عام

حضرت والا مسجد خواص میں نماز عصر پڑھ کر اس کے حجرے کے آگے جو پورب جانب تھوڑا سا صحن ہے، رونق افروز ہوتے تھے، فرش کا انتظام تھا وہیں ڈاک آ جاتی تھی، کوشش فرماتے تھے کہ مغرب تک ختم ہو جائے، اس وقت مسجد بھری ہوتی تھی، ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کم از کم زیارت تو کرلوں ہر ایک کی کوشش تھی کہ نماز کے فوراً بعد حضرت والا کی نشست کے قریب کی جگہ لے لوں تاکہ کچھ سنائی دے سکے، بعض تو دعاء سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے، اسی وقت حضرت والا کے لئے حکیم سمیع اللہ خاں صاحب بڑے اہتمام تکلف اور بڑی نفاست کے ساتھ دوا لاتے تھے اور حضرت والا استعمال فرماتے تھے، مغرب تک فیوض وبرکات کا دریا موجزن اور ملفوظات کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا، سننے والے محو و بے خود ہو جاتے تھے اور اہل مجلس مست و سرشار۔

لکھنؤ میں حضرت والا کے قیام کے زمانے میں ہر طرف حضور عالی کی تشریف آوری کے چرچے تھے، ہر شخص کی تمنا تھی کہ کسی طرح مجلس اقدس میں باریابی ہو، حضور کی زیارت ہوتی رہے اور ملفوظات عالیہ سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع مل سکے، مسجد خواص میں عام طور سے جمعہ کی نماز میں بھی اتنا مجمع نہیں ہوتا تھا جتنا حضرت کی تشریف آوری کی وجہ سے عصر و مغرب کی نماز کے وقت اور عصر کی نماز کے بعد سے مغرب کی نماز کے بعد تک ہوتا رہا، بلکہ میں نے دیکھا ہے کہ جگہ اور گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے لوگ آ آ کر واپس چلے جاتے تھے۔

باہر سے آنے والے چند زائرین کے اسماء

حضرت والا نے گو لکھنؤ تشریف لانے کا اعلان نہیں ہونے دیا لیکن اس پر بھی

دور دور اس کی اطلاع ہوگئی، بہت سے لوگوں نے خطوط کے ذریعہ سے حاضر ہونے کی اجازت طلب کی جن کو منع کر دیا گیا، لیکن قرب کے مقامات سے بہت سے اصحاب سے نہ رہا گیا اور حاضر ہو ہی گئے ان میں سے چند اصحاب کے نام جو یاد آ گئے درج ذیل ہیں:

(۱) جناب مولانا سید سلیمان ندوی عدم علم سفر کی وجہ سے حضرت والا سے ملنے کے لئے تھانہ بھون تشریف لے گئے اور جب علم ہوا کہ حضرت والا لکھنؤ میں تشریف فرما ہیں، لکھنؤ تشریف لائے اور اپنی تمنا کو پورا کیا۔ جناب مولوی عبدالماجد صاحب دریا آبادی، جناب مولوی محمد میاں صاحب، جناب خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب، جناب ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی، جناب عبدالغنی صاحب پھول پوری وغیرہ لک[۱]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی ان مجالس میں جن ملفوظات عالیہ سے لوگ مستفید ہونے کے لئے بے چین رہتے تھے، بغرض افادہ چند ملفوظات یہاں بھی پیش کر دیئے جائیں۔

---

[۱] الفصل للوصل، ص:۱۰۹تا۱۱۴۔

فصل

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے چند ملفوظات

بعد نماز جمعہ ۶/رجب ۱۳۵۷ھ بر مکان حضرت مولاناؒ

جاہل پیر کی جہالت کا نتیجہ

فرمایا رامپور میں ایک پیر صاحب تھے ان پر قبض باطنی طاری ہوا تو ان کو یہ وہم ہوگیا کہ میں مردود ہوگیا۔ لوگوں سے کہا کرتے کہ میں تو شیطان ہوں۔ فلاں مولانا صاحب کی خدمت میں گئے جو صاحب طریقت بھی تھے۔ انہوں نے پوچھا تم کون ہو بولے میں شیطان ہوں انہوں نے ویسے ہی سرسری طور پر فرمایا شیطان ہو تو لاحول ولا قوۃ إلا باللہ یہ سن کر وہ اٹھ کر آ گئے اور آ کر اپنے ایک مرید سے کہا کہ اب تو ایک شیخ نے بھی تصدیق کردی ہے، تو واقعی میں شیطان ہوں اور ایسی زندگی سے تو مرنا ہی اچھا ہے دیکھو میں خودکشی کرتا ہوں اگر کچھ کھال لگی رہ جائے تو تم الگ کر دینا۔ چنانچہ پیر صاحب نے خودکشی کرلی اور یہ مرید بھی ایسے فرمانبردار تھے کہ انہوں نے بعد زہوق روح رہی سہی کھال الگ کردی پولیس نے آ کر ان کو گرفتار کرلیا۔ نواب کلب علی خان کا زمانہ تھا ان کے یہاں مقدمہ پیش ہوا ان مرید نے کہا کہ شیخ کے بعد میں ہی زندہ رہ کر کیا کروں گا، نواب صاحب کو یقین آ گیا اور ان کو چھوڑ دیا۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے جب یہ قصہ سنا تو فرمایا کہ ہم تو سمجھتے کہ فلاں مولانا صاحب شیخ ہیں مگر معلوم ہوا نرے مولوی ہی ہیں اگر یوں کہہ دیتے کہ خیر شیطان ہو تو کیا ہے وہ بھی تو اس کا ہے (یعنی ان کی نسبت پھر بھی باقی ہے) تو ان کا قبض فوراً دور ہو جاتا۔ یہ ہے محقق کی شان، مگر مولانا کی اس تقریر پر ایک شبہ میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ کہ

جو نسبت ہے وہ محض تکوین ہے پھر حضرت مولانا نے اس جواب کو کافی شافی کیسے فرمادیا۔

الحمدللہ جواب بھی میرے ذہن میں آگیا وہ یہ کہ ایک درجہ تحقیق کا ہے ایک علاج کا اور علاج کبھی غیر تحقیق سے بھی ہوتا ہے پس حضرت مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ محض علاج ہے اور علاج کبھی محض عنوان سے ہوجاتا ہے مولانا کو وجداناً معلوم ہوگیا کہ ان کے واسطے یہ عنوان ہی کافی ہوجاتا اور یہ شیخ کی رائے پر ہے کہ جس وقت جس چیز سے چاہے علاج کردے۔

ایک بار حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نے ایسا ہی عجیب غریب مضمون ایک حدیث کے شبہے کے جواب میں فرمایا تھا کہ حضور ﷺ عبداللہ بن ابی منافق کے جنازہ کی نماز پڑھنے کے لئے تیار ہوگئے مگر حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اس کے ایسے ایسے افعال واقوال ہیں۔ آپ نے التفات نہیں فرمایا تو حضرت عمرؓ نے آیت تلاوت کی اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْلَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْلَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَاللّٰهُ لَهُمْ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا ہے تو میں نے استغفار کو اختیار کرلیا اور میں ستر بار سے زیادہ کرلوں گا۔ اب یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ عربی کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ أو تخییر کے لئے نہیں بلکہ تسویہ کے لئے ہے جیسے سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَايُؤْمِنُوْنَ۔ اس میں بھی تخییر نہیں ہے تسویہ ہے اور محاورہ کے موافق یہاں ستر کے عدد سے تحدید مقصود نہیں بلکہ تکثیر مقصود ہے تو پھر حضور نے یہ کیسے ارشاد فرمایا، تو حضرت مولانا نے یہ جواب دیا تھا کہ شدت رافت ورحمت کی وجہ سے آپ نے الفاظ سے تمسک فرمایا معنی کی طرف التفات نہیں فرمایا۔ مگر اس طرح کے استدلال کے واسطے دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ ضرورت ہو۔ دوسرے یہ کہ معنون کا انکار نہ ہو اور یہ شرطیں میں نے قواعد کلیہ سے سمجھی ہیں، خودکشی کے کے واقعہ میں ضرورت کا ہونا ظاہر ہی ہے، اور دوسرے واقعہ حدیث میں یہ ضرورت تھی جس کا ظہور بعد میں ہوا کہ بہت سے لوگ اس رافت ورحمت کو دیکھ کر مسلمان ہوگئے۔

---

[1] الفصل للوصل ۱۷۰ تا ۱۷۲۔

غیر ضروری سوالات

فرمایا غیر ضروری سوالات کے جوابات کا قصد نہ کرنا چاہئے آج کل اکثر اہل علم ہر سوال کے جواب کا قصد کرتے ہیں خواہ سوال معقول ہو یا نا معقول، اسی وجہ سے بہت گڑ بڑ ہوتی ہے، ایک مرتبہ مولانا محمد نعیم صاحب سے کسی شخص نے عرض کیا کہ فلاں شخص حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے واقعہ کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے مولانا نے فرمایا کیا کام کرتے ہو اس نے کہا رنگریزی پھر فرمایا اور وہ کیا کرتا ہے بتایا جوتے فروشی، فرمایا بھائی تم رنگریزی میں لگے رہو اور وہ جوتے بیچتا رہے تم سے قیامت میں یہ سوال نہ ہوگا کہ اس واقعہ کی حقیقت کیا تھی۔

معمولات مستقبلہ کے متعلق سوال

حضرت اقدس (تھانویؒ) کا ارادہ لکھنؤ سے دو تین یوم کے لئے کانپور تشریف لے جانے کا تھا۔ ایک صاحب نے سوال کیا کہ کانپور میں ملاقات کا کیا معمول ہوگا؟ فرمایا آپ کو کسی کے معمولات مستقبلہ کے دریافت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے جواب دینے سے وعدہ ہو جاتا ہے اور آدمی مقید ہو جاتا ہے ابھی تو میں کانپور پہنچا بھی نہیں معمول ضرورت و وقت کے تابع ہوتا ہے۔ لکھنؤ بیٹھے بیٹھے کیسے معمول بن سکتا ہے خود لکھنؤ میں حالات بدلنے کی وجہ سے کئی معمول بدل چکے ہیں۔

ذکر و عمل کی ضرورت

فرمایا حضرت حاجی صاحب ذکر و عمل کے عاشق تھے فرمایا کرتے تھے کہ بس کام کرو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

مریض کو چاہئے کہ اپنے آپ کو طبیب کے حوالے کر دے

فرمایا مریض کو چاہئے کہ اپنے آپ کو بالکل طبیب کے سپرد کر دے اور طبیب کو چاہئے کہ بے جا رعایت نہ کرے ورنہ نفع نہیں ہوگا، اسی طرح اگر مصلح مریض باطن کی بے جا رعایت کرے اور مناسب روک ٹوک نہ کرے تو فائدہ نہیں ہوگا، اور ایسے طبیب مصلح خائن کہلائیں گے۔

شیخ پر اعتراض نہ کرے

فرمایا مشائخ کا قول ہے کہ اگر شیخ کی کوئی تعلیم سمجھ میں نہ آئے تو یوں سمجھے کہ میری سمجھ کی کوتاہی ہے اور اسپر عمل شروع کر دے، شیخ پر اعتراضات نہ کرے ورنہ نفع نہیں ہوسکتا۔ جیسے طبیب نسخہ لکھے تو گو اس کی علت سمجھ میں نہ آئے مگر اس پر عمل کرنا چاہئے، اگر طبیب پر نکتہ چینی کرے گا تو اس سے نفع نہ ہوگا۔ پہلے نسخہ کو استعمال کرے پھر دیکھے کیا ہوتا ہے، بس یہی حال تعلیم شیخ کا ہے عمل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر نفع ہوا۔ البتہ اگر دلیل شرعی سے وہ معصیت ہو تو ادب کے ساتھ عذر کر دے۔

رسم و رواج کی پابندی

فرمایا رسم و رواج ایسی بلا ہے کہ اکابر تک بھی اس میں کسی نہ کسی قدر مبتلا ہوتے ہیں الا ماشاء اللہ۔ ایک بڑے مدرسہ کا ایک زبردست جلسہ ہوا، دیکھنے والے تجربہ کار اصحاب نے تیس ہزار آدمیوں کے اجتماع کا اندازہ کیا تھا میں نے منتظمین کی خدمت میں یہ رائے پیش کی کہ اہل مدرسہ اپنے اپنے زیر انتظام کچھ دکانیں کھلوا دیں۔ مختلف کھانے ہر وقت تیار رہیں تا کہ ہر شخص کو اس کے مذاق کے مطابق کھانا مل سکے نیز نرخ بھی بلا جبر و اکراہ مقرر کر کے دو کانوں پر آویزاں کر دیا جائے یا کسی اور طریقہ سے مشتہر کر دیا جائے تا کہ کسی

بیشی اور مہمانوں کی پریشانی کا احتمال نہ رہے۔ اہل مدرسہ صرف قیام کا انتظام اپنے ذمہ لیں اور کھانے کا انتظام نہ کریں آنے والے دوکانوں پر کھالیں اور جو لوگ دس دس بیس بیس روپے آمدورفت میں خرچ کر سکتے ہیں ان کو کھانے میں ایک دو روپے کا خرچ کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا اور ادھر مدرسہ کو ایک بڑی رقم بچ جائے گی، لیکن میری اس رائے کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اور صرف یہ فرما کر ٹال دیا گیا کہ عرف ومعمول کے خلاف ہے رواج اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ تیس ہزار کے مجمع کو کوئی وقت کھانا کھلایا اور کھانا بھی ایسا لذیذ وعمدہ کہ ایسے ایسے متمول لوگ جن کو اپنے یہاں کے کھانے پر ناز تھا کہتے تھے کہ ہم نے ایسا کھانا کہیں نہیں کھایا تھا۔ ادھر تو مدرسہ کو زبردست زیرباری ہوئی اور ادھر منتظمین کی ایک بڑی جماعت مواعظ میں شریک نہ ہوسکی حالانکہ جلسہ کا اصل مقصود مواعظ ہی تھے، یہ ہے رواج کی پابندی کا نتیجہ۔

اسی سلسلہ میں یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ زبردستی نرخ مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں لوگوں کو راحت پہنچانے کے لئے اگر باہمی مفاہمت سے ایسا کر دیا جائے تو بہتر ہے، پھر فرمایا میرے یہاں اب یہ دستور ہے کہ مہمان جتنے دنوں چاہے قیام کریں اپنے کھانے کا انتظام خود کریں گے۔ ہاں جن سے خصوصیت اور بے تکلفی ہے اور ان کا قیام بھی قلیل ہو یا ان کو انتظام میں دقت ہو تو ان کا کھانا مکان سے آتا ہے گو میرا یہ دستور رواج کے خلاف ہے لیکن اس میں طرفین کو راحت ہے۔ مہمان جب چاہیں اور جو چاہیں کھا پی سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قیام میں آزاد ہیں جتنا جی چاہے قیام کریں ورنہ بہت سے غیور طبع انسان بجائے پندرہ یوم کے پانچ یوم بھی نہ ٹھہر سکتے۔ یوں کہتے کہ مفت کی روٹیاں کھانا یا بار ڈالنا مناسب نہیں۔ نیز جلد جلد آنے کا ارادہ بھی نہ کر سکتے۔ اور ان باتوں سے ان کا دینی نقصان ہوتا۔ اب بحمداللہ تعالیٰ یہ خرخشے نہیں ہیں۔ اور میں اس فکر سے آزاد ہوں کہ مہمانوں کے لئے کیا پکا اور کب پکا۔ کون مہمان موجود ہے کون غائب ہے۔

کوئی پرہیزی کھانا تونہیں کھاتا وغیرہ وغیرہ۔اب جب اس اطمینان کے ساتھ میں دینی خدمات انجام دے سکتا ہوں مہمان نوازی کی صورت میں کہاں ممکن تھا۔خصوصاً اس صورت میں کہ مہمان بھی بڑی تعداد میں بکثرت آتے رہتے ہیں[1]

حرکات کی ناموزونیت

فرمایا میں نامناسب حرکت وسکون اور غیر موزوں افعال واقوال پر روک ٹوک کرتا ہوں بالخصوص جن باتوں سے کسی کو تکلیف ہو ان پر دارو گیر کرتا ہوں مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو میرے طرز عمل سے تعجب ہوتا ہے کیونکہ نہ ان کو وہ اعمال ناموزوں معلوم ہوتے ہیں اور نہ وہ ایسے امور سے کچھ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے جن کا ادراک باطل یا ضعیف اور احساس مجروح اور کمزور ہوتا ہے وہ ناشائستہ حرکات سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں۔مگر ایسے لوگوں سے دوسروں کو بہت اذیت ہوتی ہے۔

ضعف کی وجہ سے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھانے کا تحمل نہیں رہا

ایک صاحب نے حضرت کی دعوت کرنا چاہی اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ حضرت کے ہمراہ چند احباب کو اور بھی مدعو کرنا چاہتا ہوں حضرت نے فرمایا اب میں ضعف کی وجہ سے کسی کے ساتھ کھانے کا متحمل نہیں ہوں۔پہلے مہمانوں کے ساتھ کھانا کھایا کرتا تھا لیکن اب یہ معمول ترک کردیا ہے ساتھ کھانے سے یا تو پیٹ نہیں بھرتا یا زیادہ کھانا پڑتا ہے کیونکہ جلیس یا جلساء کی رعایت کرنا پڑتی ہے اس لئے ساتھ کھانے سے معذوری ہے۔اسی سلسلہ میں فرمایا کہ ہمارے قصبات میں عام عرف ہے کہ بیویاں شوہروں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتیں، میں نے اس رسم کو توڑ دیا ہے۔دونوں گھروں میں ساتھ کھانا کھاتا ہوں۔چونکہ اپنے اہل سے بے تکلفی ہوتی ہے اس لئے تکلیف نہیں ہوتی

---

[1] الفصل للوصل ص ۳۳۵۔

نہ وقت کی پابندی نہ ساتھ دینا ضروری۔ جب جی چاہا اور جتنا جی چاہا کھالیا۔مگر مہمان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جاتا فطری طور پر ان کی رعایت کی جاتی ہے اس لئے اب اس کا متحمل نہیں۔

اسراف کی حقیقت

ایک صاحب نے کہا کہ بعض مرتبہ آٹھ آنہ سیر برف لینا پڑتا ہے مگر کیا کروں عادت کی وجہ سے اس اسراف کو برداشت کرتا ہوں، حضرت نے فرمایا جس کو عادت ہو اس کو آٹھ آنہ سیر برف خریدنا اسرف نہیں بلکہ اس کی ضروریات زندگی میں داخل ہے۔

مسلمانوں کی بے استقلالی

فرمایا مسلمان اپنی قوت سے کام نہیں لیتے۔ استقلال اور جم کر کوئی کام نہیں کرتے۔ بہت جلد پژمردہ اور بددل ہوجاتے ہیں اسی لئے ان کی تحریکات غیر مکمل اور ان کے اعمال ادھورے رہ جاتے ہیں۔ یہ بات دین کی کمی اور ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔جتنی دین میں کمی ہوگی اسی قدر بزدلی پیدا ہوگی۔ دل میں مطلوب طاقت صرف روحانیت وایمان سے پیدا ہوتی ہے اور دل کی طاقت ہی کا نام دلیری اور شجاعت ہے۔

صفائی معاملات دین کا ایک اہم جزو ہے

فرمایا مجھ کو معاملات کی صفائی بہت پسند ہے معاملات کی صفائی دین کا ایک اہم اور ضروری جزو ہے۔ اگر میں گھر والوں سے بھی کسی فوری ضرورت کے لئے کچھ قرض لے لیتا ہوں تو دوسرے وقت واپس کر دیتا ہوں اور وہ بھی لے لیتے ہیں۔ میں ان کے اس طرز عمل سے بہت خوش ہوں، میں نے کہہ رکھا ہے کہ جس کا جو مطالبہ میرے ذمہ ہو وہ یاد دلا دے میں اس سے خوش ہوتا ہوں۔

پابندی معاملہ

فرمایا انسان کو چاہئے معاملہ کے وقت تو اپنے آپ کو زیادہ پابند نہ کرے اور بہت قیود وشروط کو قبول نہ کرے۔ آزاد رہے، ہاں جب عمل کا وقت آئے تو جتنا ممکن ہو مقید بنے اور بہتر سے بہتر طور پر کام کرے، ہر بات کی رعایت رکھے۔

اپنی رضا کو بڑوں پر قربان کر دے

فرمایا حدیث شریف میں ہے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے ایک اونٹ خریدا آپ نے قیمت ادا فرمائی۔ انہوں نے قبول کر لی حقیقۃً حضور کا یہ معاملہ امت کے لئے تعلیم ہے کہ معاملہ اس طرح کرنا چاہئے تا کہ راحت نصیب ہو۔ حضرت جابرؓ ہرگز دام لینے کے مشتاق وخواہشمند نہ تھے مگر حضور کی رائے مبارک کو اپنی خواہش پر ترجیح دی۔ حضرات صحابہؓ کی عموماً یہی عادت تھی کہ حضور کی مرضی کو اپنی تمام خواہشوں پر ترجیح دیتے تھے۔ جس حالت میں حضور خوش ہوتے یہ حضرات اسی حال میں راضی رہتے تھے۔

راضی ہوں میں اسی میں جس میں ہوں آپ راضی
میری وہی خوشی ہے جو آپ کی خوشی ہے

حکومت اسلامیہ کے قیام کی تمنا

میری دلی تمنا اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت عادلہ مسلمہ قائم فرمادے اور میں اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں، میں نے عادلہ کی قید اس واسطے لگائی کہ سلطنت مسلمہ تو بحمدہٖ تعالیٰ آج کل بھی متعدد جگہ ہے مگر عادلہ نہیں بلکہ سب کی حالت بے راہی کی ہے امور شرعیہ کی پابندی نہیں، موجودہ مسلم سلطنتوں میں نجدیوں کی سلطنت غنیمت سمجھی جاتی

تھی مسلمانوں کو ان سے بہت توقعات تھیں کیونکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قرآن وحدیث پر عامل ہیں مگر انہوں نے ایسی لٹیا ڈبوئی ہے کہ خدا کی پناہ، عیسائیوں کو حجاز کی سرزمین مقدس میں داخل کرلیا اور ایک طویل مدت کے لئے ان کو ٹھیکہ دیدیا ہے ابن سعود نے، اور یہ سب کچھ روپیہ کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ ترکوں کے زمانہ میں کبھی ایسا نہ ہوا حالانکہ وہ بیچارے قرآن وحدیث پر عمل کرنے کے مدعی بھی نہ تھے۔ اس ٹھیکہ کے انجام کی یقینی طور پر تو خبر نہیں مگر آثار اور حالات حاضرہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عرب کے بدویوں کے ایمان کا سخت خطرہ ہے کیونکہ عرب پہلے ہی ایک مفلس قوم ہے خصوصاً بدوی تو حد درجہ مفلوک الحال اور تنگدست ہیں اور آج کل تو ان کے افلاس میں اور اضافہ ہو گیا کیونکہ وہ پہلے حجاج کو اونٹ کرایہ پر دے کر کچھ کما لیتے تھے۔ اب موٹروں نے اس سلسلہ کو بھی قریب الختم کر دیا ہے۔

حضرت کا تفقّہ

فرمایا ایک مرتبہ مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ترمذی میں یہ حدیث ہے لـن يغلب إثنا عشر ألفاً عن قلة یعنی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بارہ ہزار مسلمانوں کا لشکر قلت تعداد کی وجہ سے کبھی دشمنوں کے مقابلہ میں مغلوب نہ ہوگا۔ اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا حالانکہ ثابت ہے کہ بارہ ہزار کیا بارہ ہزار سے کہیں زائد تعداد کے لشکر شکست کھا گئے۔ حضرت مولانا کی برکت سے میرے ذہن میں فوراً جواب آ گیا، میں نے عرض کیا کہ حدیث شریف کا مضمون بالکل بے غبار ہے، حضور نے عن قلة فرمایا ہے کہ قلت کی وجہ سے مغلوب نہ ہوگا عن علة نہیں فرمایا کہ کسی اور سبب سے بھی مغلوب نہ ہوگا لہذا جہاں بارہ ہزار یا بارہ ہزار سے زائد کے لشکر شکست کھا گئے اس کی وجہ قلت نہیں بلکہ کوئی دوسری علت ہوگی چنانچہ اس کی تائید کتب حدیث

وتاریخ سے بھی ہوتی ہے، بلکہ قرآن شریف کا غزوہ حنین میں اولاً مغلوب ہونا بالتصریح مذکور ہے حالانکہ غزوہ حنین میں مسلمان بارہ ہزار تھے لیکن پھر بھی اولا مغلوب ہو گئے۔اور اس کی وجہ قلت نہیں تھی بلکہ ایک قلبی مرض یعنی خود پسندی وعجب تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْاَ عْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ .

"یعنی حق تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد فرمائی اور غزوہ حنین میں بھی جب تم اپنی کثرت پر نازاں تھے"۔

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو غزوہ حنین میں عجب وغرور پیدا ہو گیا تھا کہ ہم اتنے زائد ہیں، اسی عجب کی وجہ سے شکست ہوئی اور جب اس گناہ سے توبہ کر لی اور معافی مانگ لی تو اسی میدان میں یہ ہزیمت خوردہ لشکرِ اسلام غالب آ گیا۔جس کا ذکر اس آیت کریمہ میں ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَه' عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا۔

"یعنی شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنی خاص تسلی نازل فرمائی اور قلوب کی تقویت کے لئے فرشتوں کا لشکر بھیجا جو نظر نہیں آتا تھا۔"[1]

---

[1] الفصل للوصل ص ۳۰۵ تا ۳۶۴

باب ۳

حضرت مولاناؒ کی کتاب سیرت سید احمد شہید کا ہدیہ حکیم الامت تھانویؒ کی خدمت میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

۱۹۳۹ء میں میری کتاب ''سیرت احمد شہیدؒ'' شائع ہوئی میں نے تو اس کے بھیجنے کی جرأت نہیں کی لیکن میری بے خبری میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے اس کو ایک دوسری کتاب کے ساتھ جو ان کو بہت پسند تھی، ایک صاحب تعلق کے ذریعہ مولانا کی خدمت میں اس تصریح کے ساتھ بھیجی کہ اگر حضرت کو کچھ گرانی ہو تو اس کو بلا تکلف واپس فرما سکتے ہیں، مولانا نے یہ ہدیہ قبول کیا، دوسری کتاب اسی وقت کسی صاحب کو دیدی اور ''سیرت'' خود اپنے مطالعہ کے لئے رکھ لی، اس کے جواب اور شکریہ میں مولانا منظور صاحب کو ایک خط لکھا جس میں ان کی اس رعایت پر مسرت وانبساط کا اظہار بھی فرمایا، اور سیرت کے متعلق اپنے تاثرات بھی تحریر فرمائے، یہ مکتوب یہاں بجنسہ نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے مولانا کے مزاج ومذاق اور اصلی جذبات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ

بخدمت مکرم بندہ دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل کے روز صحیفہ عنایت مع دو رسالہ ہدیہ کے پہونچکر منت بخش ومسرت افزا ہوئے، بسر وچشم قبول کیئے، اور آپ کی اس ادا نے زیادہ فریفتہ کر دیا کہ آپ نے میرے اصول کو اپنے جذبات پر ترجیح دے کر قبول عذر کر دینے کی بھی اجازت دے دی، چونکہ

میرے اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرات مخلصین کی اطاعت کو فخر وسعادت سمجھتا ہوں، لہٰذا ان کے قبول میں بھی میرے اصول محفوظ ہیں، ایک میرے اصول میں سے یہ بھی ہے کہ اپنے احباب کے عطایا سے قلب پر جو اثر ہوتا ہے اس کا اخفاء نہیں کرتا، چنانچہ اس ہدیہ سے خصوص سیرت شہید سے قلب پر دو اثر ہوئے ایک مسرت کا دوسرا خجلت کا، وہ خجلت یہ کہ کتاب دیکھ کر اپنی ناکارگی سامنے آجاتی ہے کہ ہم میں نہ ہمت نہ غیرت، بہائم کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں کہ بجز خواب وخور کے کوئی شغل نہیں، لہٰذا ایسی چیزیں اگر ایسوں کو دی جائیں جو ان سے کام لیں تو ہدیہ ضائع نہ ہو اب دعا کی درخواست پر ختم کرتا ہوں اللہ تعالیٰ بزرگوں کا اتباع نصیب فرمادے۔ اشرف علی (پرانے چراغ ۱۲۶)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تھانہ بھون حاضری اور حضرت اقدس تھانویؒ کی خاص شفقت وعنایت

بالآخر وہ دن بھی آ گیا کہ تھانہ بھون حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور جس جگہ کے قصے آنے جانے والوں سے برسوں سے سننے میں آرہے تھے، اس کو بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا کہتے ہیں کہ پھول شاخ گل پر اور چمن کے اندر ہی اپنی صحیح شکل وصورت میں نظر آتا ہے، غالباً ۱۹۴۲ء اور مئی یا جون کا مہینہ تھا، اتنا یاد ہے کہ خوب گرمی تھی، اور لو چل رہی تھی، میں مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی میں چھوٹی لائن پر سفر کر رہا تھا جو شاہدرہ سے سہارنپور تک جاتی تھی، اور جس میں وہ سب مقامات وقصبات پڑتے تھے جن سے بزرگان دین ودیوبند کی تاریخ وابستہ ہے، یعنی کاندھلہ، تھانہ بھون، نانوتہ، اور رام پور منیہاران، اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلے سے قصد تھا یا اثنائے سفر میں یہ خیال ہوا کہ تھانہ بھون بھی حاضری دی جائے، نظام کچھ ایسا تھا کہ کاندھلہ مولانا کے ساتھ قیام کر کے جو ان کا وطن تھا، رام پور منیہاراں جانا تھا، تھانہ بھون کاندھلہ اور رام پور کے درمیان واقع ہے، میں نے مولانا سے

اجازت لی کہ میں ایک روز پیشتر کاندھلہ سے روانہ ہوجاؤں اور چوبیس گھنٹے تھانہ بھون قیام کر کے اسی گاڑی پر سوار ہوجاؤں جس سے مولانا رام پور تشریف لے جائیں گے، مولانا خود تھانہ بھون کے عقیدت مندوں میں سے تھے، اور مولانا تھانویؒ کو اپنے مشائخ کی صف ہی میں سمجھتے تھے، یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور بڑی بشاشت ومسرت کے ساتھ اجازت دی، تھانہ بھون کے ایک صاحب تعلق تھانہ بھون جارہے تھے میں نے اپنی آمد کی اطلاع کا خط لکھ کران کے حوالہ کرنا چاہا کہ وہ خود پیش کردیں، انہوں نے کہا کہ یہ ضابطہ کے خلاف ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کو پوسٹ بکس میں ڈال دیں، انہوں نے اس کو منظور کیا، میں ایک روز کاندھلہ ٹھہر کر تھانہ بھون روانہ ہوا، ٹھیک دوپہر کو گاڑی تھانہ بھون پہونچتی تھی، خانقاہ امدادیہ کا اسٹیشن سے کچھ زیادہ فاصلہ نہیں، میں ایک حمال کو ساتھ لے کر پیدل خانقاہ پہنچ گیا، تھانہ بھون کے قواعد وضوابط اور آداب کے متعلق اتنا سن رکھا تھا، اور داروگیر اور احتساب کے واقعات بھی اتنے کان میں پڑ چکے تھے کہ ڈرتے ڈرتے خانقاہ میں قدم رکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ میں داخل ہورہا ہے، گرمی اور دوپہر کی وجہ سے وہاں سناٹا تھا، مقیمین خانقاہ اپنے اپنے حجروں میں آرام کررہے تھے، میں ایک طرف سامان رکھ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر کے بعد ظہر کی اذان ہوئی، مولانا تشریف لائے، وضو فرمایا، میں نے اس وقت اپنا تعارف مناسب نہیں سمجھا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کی اس سہ دری میں جو جانب جنوب واقع ہے، اور مولانا کی نشست گاہ رہتی تھی، مجلس شروع ہوئی، چیدہ چیدہ حضرات اور خواص تھے، جن میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوبؔ کو میں پہچانتا تھا، میں بھی حاضر ہوا اور کنارے بیٹھ گیا، سہ دری میں قدم رکھتے ہی میری نظر اس ڈیسک پر پڑی جو مولانا کے سامنے تھی، اور جس پر خطوط اور لکھنے پڑھنے کا سامان رکھا ہوا تھا، انہی کاغذات اور سامان میں ''سیرت سید احمد شہیدؒ'' جس کو چھپے ہوئے تین سال سے زائد ہوچکے تھے، سامنے رکھی تھی، معلوم نہیں مولانا نے میری دل جوئی اور مجھے مانوس کرنے کے لئے اس کو اسی دن نکالا تھا، یا وہ عام طور پر اسی

جگہ رکھی رہتی تھی، اس کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ایک نہایت عزیز دوست میرے تعارف اور تقریب کے لئے موجود ہے، اس کی موجودگی سے اجنبیت کے احساس میں بڑی کمی ہوئی، مولانا خطوط کے جواب دینے میں مصروف تھے، چند منٹ کے بعد خواجہ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا خواجہ صاحب! ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کے بھائی آنے والے تھے آئے نہیں؟ اب میں نے خاموش رہنا نامناسب سمجھا، آگے بڑھا اور عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ آپ نے بتایا نہیں، آیئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھادیا، میں نے عرض کیا حضرت کے حرج کے خیال سے عرض نہیں کیا، فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کیا حرج ہوتا کہ مجھے آپ کی آمد کا علم نہ ہوتا، خجلت ہوتی، ندامت ہوتی، افسوس ہوتا، مکرر کئی لفظ فرمائے، سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ فرمائی کہ میں نے تو آج آپ کی وجہ سے خطوط کا بہت سا کام پہلے کرلیا تھا، تاکہ آپ سے اطمینان سے باتیں کرنے کا موقع ملے، یہ گویا حضرت کی طرف سے انتہائی رعایت اور اعزاز تھا، جو اس نوعمر و گمنام آنے والے کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا، پھر مزاج پرسی کے بعد بڑی شفقت سے فرمایا کہ کوئی اور رفیق تو ساتھ نہیں؟ کھانے میں کیا معمول ہے، کوئی پرہیز تو نہیں؟ اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت اپنا ہی مہمان رکھیں گے، یہ بھی عام روایات اور تجربات کے خلاف تھا، اور مہمان کے ساتھ بڑی خصوصیت وشفقت، میرے عرض کرنے پر کہ کوئی پرہیز نہیں ہے، معذرت فرمائی کہ میں آج کل طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے ساتھ نہیں کھاسکوں گا، اس کا کچھ خیال نہ فرمائیں، پھر فرمایا کہ قیام کتنا رہے گا، میں نے عرض کیا کہ اگلے روز دوپہر کو جانا ہے، فرمایا بس اتنا مختصر قیام؟ پھر فرمایا کہ میں اپنے دوستوں سے زیادہ قیام کے لئے اصرار نہیں کرتا کہ گرانی کا باعث نہ ہو، اور شاید جو حضرات اتنا وقت بھی دیتے ہیں، ان کو آنے میں پس وپیش ہو اس کے بعد مجلسی گفتگو شروع ہوگئی، زیادہ تر واقعات خاندان ولی اللہی اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب کے تھے۔

حضرت تھانویؒ کا خصوصی برتاؤ

رات کھانا حضرت کے دولت خانہ سے آیا، کھانے میں اہتمام اور تنوع تھا، صبح نماز فجر کے بعد خواجہ صاحب حضرت کا پیغام لائے کہ فلاں وقت میری خصوصی مجلس کا ہے، جس میں مخصوص احباب کو شرکت کی اجازت ہے، لیکن اگر ضرورت ہو تو میں اس سے بھی الگ وقت دے سکتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی خصوصی بات عرض کرنی نہیں ہے، زیارت و استفادہ کے لئے حاضر ہوا ہوں، اسی خصوصی مجلس میں حاضر ہو جاؤں گا، تقریباً چاشت کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، دو ہی چار حضرات تھے، ان میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجھے یاد ہیں، حضرت نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ خواجہ صاحب میرا جال لے آیئے، خواجہ صاحب تعمیل ارشاد میں اٹھ تو گئے، مگر سمجھے نہیں، آپ نے فرمایا خواجہ صاحب سمجھے کہ میرا جال کیا ہے؟ خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت نہیں، فرمایا کہ تسبیح، یہی ہم لوگوں کا جال ہے، جس سے ہم لوگوں کو پھانستے ہیں۔

حضرت اقدس تھانویؒ کی مجلس کا رنگ

مجلس میں اول سے آخر تک بڑا انبساط رہا، خشونت تو الگ رہی کسی درجہ کی خشکی اور یبوست بھی کہیں آس پاس نہ تھی، خندہ جبینی، شگفتہ بیانی، زندہ دلی، اور نکتہ سنجی مجلس کو باغ و بہار بنا دیتی تھی، تھانہ بھون کے متعلق جو تصور قائم ہوا تھا، معلوم ہوا کہ اس میں جہاں تک مولانا کی ذات کا تعلق ہے، مبالغہ اور غلط فہمی کو دخل ہے، ضوابط ضرور تھے مگر استثناءات بھی بکثرت، طالبین اور زیر تربیت اشخاص کے لئے احتساب اور مواخذہ تھا۔ مگر زائرین اور کبھی کبھی کے آنے والوں کے لئے نیز ان لوگوں کے لئے جن کا تعلق مستقل اصلاح و تربیت کا نہیں تھا، شفقت و رعایت۔

مولانا ان ضوابط پر حاکم تھے، محکوم نہ تھے، واضع تھے مقلد نہ تھے، وہ جہاں چاہتے اور جس کے لئے چاہتے ضابطہ کو بالکل بالائے طاق رکھ دیتے اور اسی کو اس وقت کا ضابطہ سمجھتے۔

ندوہ کے کتب خانہ سے حضرت اقدس تھانویؒ کا علمی استفادہ

حضرت اقدس تھانویؒ کی وسعت نظر و وسعت قلب

اس کے بعد نہ پھر تھانہ بھون حاضری کا اتفاق ہوا نہ لکھنؤ مولانا کے قدوم سے مشرف، البتہ مکاتبت، معنوی اور علمی استفادہ اور محبت وعقیدت کا تعلق ہمیشہ رہا، بھائی صاحب سے بھی کبھی کبھی مراسلت ہوتی، ایک مرتبہ حضرت نے ندوہ کے کتب خانہ سے بعض کتابیں مطالعہ کے لئے طلب فرمائیں اور ان کے بحفاظت واپس ہونے کے لئے اور بھیجنے والے پر کسی قسم کا بار نہ پڑنے کا اہتمام فرمایا، جو مولانا کا مزاج بن گیا تھا، اور جس کی رعایت ونگہداشت میں وہ اپنے اقران واماثل میں بھی بہت ممتاز تھے، یہاں پر مولانا کا وہ مکتوب درج کیا جاتا ہے جو مولانا نے اس موقع پر بھائی صاحب کے نام تحریر فرمایا تھا، اور جس سے مولانا کی وسعت نظر اور وسعت قلب کا بھی اندازہ ہوگا اور اس کا بھی کہ مولانا شیخ الاسلام ابن تیمیہ، اور علامہ ابن قیم کو کس نظر سے دیکھتے تھے، اور کس ادب واحترام سے ان کا نام لیتے ہیں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

مکرمی ومحترمی دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کتاب ''اعلام الموقعین مع حادی الارواح وشفاء العلیل'' سے میرا مستفید ہونا ندوہ کا فیض ہے جس کا میں ممنون ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں، جس مضمون کو دیکھنے کو میں نے کتاب منگوائی تھی، اس مقصود میں تو میں حضرت مؤلف کا موافق نہیں ہوں، مگر خود اس

مقصود میں جن مقدمات سے انہوں نے کام لیا ہے، وہ بجائے خود علوم عالیہ ہیں، جن سے مجھ کو عجیب وغریب نفع ہوا، اس مضمون کو میں نے نقل بھی کرالیا، جس کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ جس وقت مجھ کو یا کسی دوسرے دوست کو فرصت ہوتو اس کا جواب ادب کے ساتھ لکھا جائے، اس نقل کے سبب واپسی میں دیر ہوئی، الحمدللہ آج اس کو واپس کر کے سرخ رو ہوتا ہوں، ایک خط میں آمد کا محصول ومصارف ۷/ لکھا تھا اس لئے ۸/ بصورت ٹکٹ روانہ خدمت ہے اگر گرانی نہ ہوتو ایک کارڈ پر پہونچنے کی اطلاع فرما کر مطمئن کر دیا جائے، باقی بجز دعا گوئی ودعا جوئی کیا عرض کروں،

والسلام اشرف علی از تھانہ بھون۔

حضرت اقدس تھانویؒ کا وصال

رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ لکھنؤ تشریف لائے اور اس کی وجہ سے شہر میں ایک خاص برکت ورونق اور دینی وایمانی فضا پیدا ہوگئی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب بھی دوسرے روز تشریف لے آئے ایک بڑی تبلیغی جماعت بھی آئی ہوئی تھی ہم سب لوگ اسی دینی دعوت اور تبلیغی نقل وحرکت میں مصروف اور مسرور تھے کہ اچانک یہ جانگداز اور روح فرسا خبر سنی کہ ۱۷/ رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹/ جولائی ۱۹۴۳ء) کو تھانہ بھون کا یہ آفتاب علم وارشاد غروب ہوگیا، حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی بھی ٹھیک انہی دنوں میں لکھنؤ تشریف لائے، معلوم نہیں انہوں نے یہ خبر راستہ میں سنی یا لکھنؤ آکر لیکن ان کی بے قراری اور رنج وقلق دیکھنے کا تھا اس وقت ہم لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کو اپنے شیخ سے کیسا گہرا تعلق ہے۔

"کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام".

---

[1] پرانے چراغ، ص: ۳۳۰۔

باب ۴

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شان مجددیت کی ہمہ گیری

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اللہ تعالی نے جو اصلاحی وتجدیدی کام لیا اور جس کا اعتراف اس عہد کے سب صاحب بصیرت اور صاحب انصاف علماء راسخین اور وقت کے مشائخ و مصلحین نے کیا، اس کا دائرہ زیادہ تر اخلاق اصلاح معاملات تزکیہ نفس اور عمل بالشریعۃ کے دائرہ میں محدود سمجھا جاتا تھا لیکن فاضل عزیز مولوی محمد زید مظاہری (سابق) مدرس جامعہ عربیہ ہتورا (**بارک اللہ فی حیاتہ وفی افاداتہ**) نے جو حضرت حکیم الامت کے افادات وارشادات اور تحقیقات ونظریات کومختلف عنوانوں اور موضوعات کے ماتحت اس طرح جمع کررہے ہیں کہ حضرت کے علوم وافادات کا ایک دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) تیار ہوتا جارہا ہے۔

اس وقت پیش نظر کتاب میں جو''اسلامی حکومت ودستور مملکت قرآن وحدیث کی روشنی میں'' کے نام سے موسوم ہے، انہوں نے حضرت کے افادات وارشادات وتحریرات کے وہ اقتباسات جمع کردیئے ہیں جن سے یہ حقیقت بدیہی طور پر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت اپنے اسلاف کرام اور مقتدایان عظام کی اتباع واقتدا میں (جن میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ بھی تھے اپنے ذہن کو اس شعبہ وضرورت سے فارغ نہیں فرمالیا تھا، آپ کی تحریرات وافادات میں جابجا ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ اپنے مطالعہ، تحقیق وتجربہ اور ذوق کے مطابق اعلاء کلمۃ اللہ اور نفاذ شریعت کے مقصد سے، اور حکومت اسلامی کے قیام کی ضرورت واہمیت سے خالی الذہن نہیں تھے۔[1]

---

[1] اقتباس از مقدمہ اسلامی حکومت ص ۳۵۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کا فقہ وفتویٰ میں مقام

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ (م ۱۳۶۲ھ) کے علمی وفقہی کارناموں کے تفصیلی بیان کے لئے تو ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، مشہور ہے کہ مولانا کی چھوٹی بڑی تصانیف تقریباً ایک ہزار ہیں جن میں تفسیر، تصوف، فقہ، شرح حدیث اور حکمت اسلام جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحثیں ملتی ہیں، لیکن یہاں ان کی صرف فقہی خدمات کا مختصر تذکرہ کرنا ہی اس وقت پیش نظر ہے، مولانا کی مقبول عام کتاب ''بہشتی زیور'' کے علاوہ ان کے فتاوی (مسمی بہ امداد الفتاویٰ) کا سات جلدوں پر مشتمل عباداتی، تمدنی، معاشرتی، معاملاتی وغیرہ سوالات کے جوابات کا بیش قیمت اور عظیم ذخیرہ ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ عصر حاضر کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا ان میں نہ صرف حل پیش کیا گیا ہے، بلکہ ایسی اصولی ہدایات ملتی ہیں جن سے آئندہ، اس موضوع پر کام کرنے والوں کیلئے، راہنمائی کا پورا سامان ہے، چنانچہ کسی بھی نئے پیش آمدہ مسئلہ کا حل دریافت کرنے کے لئے آج کے علماء وفقہاء ان کی تحقیقات وہدایات سے استفادہ کئے بغیر ایک قدم آگے بڑھانا مشکل سمجھتے ہیں، مولانا کی زمانہ شناسی اور احساس وفکر مند طبیعت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ''الحیلۃ الناجزۃ'' ہے جس میں دنیا بھر کے معتمد علماء کی آراء جمع کر کے آج کی مظلوم منکوحہ عورت کی متعدد دشواریوں کا آسان حل پیش کیا گیا ہے[1]

اصلاح اخلاق ومعاملات اور اصلاح معاشرت ورسوم کا مجدد وامام

اصلاح اخلاق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ قدس سرہ کا مجددانہ کارنامہ اور امتیازی وصف ہے، اصلاح معاملات واخلاق اور اصلاح معاشرت واصلاح رسوم وہ عنوان ومیدان ہے جس کے اس دور میں امام ومجدد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

---

[1] تدوین فقہ اور چند اہم فقہی مباحث ص ۲۱۱ [2] اقتباس از پیش لفظ ''حیات مصلح الامت'' از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اصلاح باطن اور فن تصوف میں مولانا اشرف علی صاحب کا مقام اور آپ کی روحانی مطب کی خصوصیت

راقم کے خیال میں دو علم ایسے ہیں جن کی تجدید ہر زمانہ میں اور ہر نسل کے لئے ضروری ہے وہ کبھی نئے تجربوں، زمانہ اور ماحول کی رعایت، طبیعتوں اور مزاجوں کے تغیر کی دیکھ بھال اور لحاظ اور زندگی سے بار بار رشتہ قائم کرنے سے مستغنی نہیں ہو سکتے، ایک طب اجسام کا علم اور ایک طب قلوب کا علم یا دوسرے لفظوں میں ایک معالجہ جسمانی دوسرے معالجہ روحانی کا علم، پہلے علم کا عرفی اور اور مشہور نام طب و حکمت (میڈیسن) ہے، اور دوسرے کا عرصہ سے تصوف نام پڑ گیا ہے، حالانکہ اس کا قرآنی نام تزکیہ (ویزکیھم) اور حدیث و سنت کی اصطلاح ''احسان'' ہے (**ما الاحسان قال: ان تعبد اللہ کانک تراہ**) اور بہت اچھا ہوتا کہ یہ علم انہیں دو ناموں سے موسوم ہوتا کہ بہت سے تنازع اسی سے ختم ہو جائیں اور بہت سی صلاحیت اور وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا، بہر حال جیسا کہ خود حضرت سید صاحب نے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا ہے:

''اصطلاحات تنازعہ کی چیز نہیں، اور ناموں کے اختلاف سے حقیقت نہیں بدلتی''۔

چنانچہ ان دونوں علوم میں تجدید کا جو عمل جاری رہا اور جس طرح ان کے ماہرین نے زمانہ کے تغیرات، ملک و قوم کے تنوعات، موسموں اور آب و ہوا کی تبدیلی، طبیعتوں اور مزاجوں کے فرق کی رعایت کی وہ ان دونوں علوم کی عہد بعہد کی کتابوں اور ان کی تاریخ سے واضح ہوتا ہے، اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور جب تک یہ علوم یکسر اپنی افادیت اور ان کے حاملین اپنی صلاحیت نہیں کھودیتے جاری رہے گا۔

اسی طرح ان دونوں علوم میں ایک اور حقیقت مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ان

دونوں علوم میں اجتہاد سے چارہ نہیں، ہر جسمانی معالج اور ماہر فن کو کسی نہ کسی درجہ میں اجتہاد سے کام لینا اور اپنے فن کی شاہراہ عام سے اور اس کے عام ضوابط وکلیات سے آزاد ہونا پڑتا ہے، اور بعض مرتبہ عام قانون سے ہٹنے کا خطرہ تک مول لینا پڑتا ہے، اس کے بغیر وہ بعض مزمن امراض کا علاج اور بعض جاں بلب مریضوں کی مسیحائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا، یہی حال اخلاقی وروحانی معالج کا ہے کہ وہ مقلد محض بن کر مختلف الطباع اور متنوع اور مختلف المزاج مریضوں اور پیچیدہ امراض کا علاج نہیں کر سکتا اور اس کو بار بار اپنے فن اور اس کے پیشواؤں کی نپی تلی راہ سے اپنا اور اپنی خداداد ذہانت اور اس فراست ایمانی سے جس میں بصیرت احسانی بھی شامل ہوگئی ہے، نیا نسخہ تجویز کرنا اور نیا مرکب تیار کرنا پڑتا ہے، وہ بعض اوقات اس فن کے مبتدیوں اور سطحی النظر لوگوں کو علاج بالمثل یا علاج بالسمیات نظر آتا ہے، لیکن وہ ان مریضوں کے حق میں نوشدارو اور آب حیات بن جاتا ہے۔

طب قلوب وارواح یا ''فقہ باطن'' یا تزکیہ واحسان کا یہ علم جس کو ہم مجبوراً تصوف کہتے ہیں، تجدید وارتقاء کے منازل سے برابر گذرتا رہا اور ہر دور میں اس میں اجتہادی شان بلکہ انقلابی فکر نظر آتی رہی، سیدنا عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بہاء الدین نقشبند اور شیخ شہاب الدین سہروردی اپنے اپنے دور کے امام اور اس فن کے مجتہد مطلق تھے، ان کے بعد ہر ایک کے سلسلہ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجدد مجتہد پیدا ہوتے رہے۔ جن کے ناموں اور کارناموں کی تفصیل اس علم کی مفصل تاریخ کا موضوع ہے اور اس مختصر مضمون میں اجمالی طور پر بھی اس کا تذکرہ ممکن نہیں، اس سلسلہ میں امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی، حضرت سید آدم بنوری، حضرت سید احمد شہیدؒ حضرت شاہ غلام علی اور دور آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کا نام اس حیثیت سے لینا ضروری ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے دور میں مقاصد کے لئے وسائل کے انتخاب، اجزاء

سلوک میں حذف و اختصار اور اس کو مؤثر و سہل بنانے اور مختلف تجربات کو باہم ملانے میں نمایاں اجتہاد سے کام لیا۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک طلائی کڑی حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذات تھی وہ ایک طرف علوم دینیہ کے ایک متبحر اور راسخ العلم عالم تھے، دوسری طرف ان کو ایسا زمانہ ملا جو نئے نئے تمدنی مسائل و مشکلات سے گرانبار تھا، زندگی کی مصروفتیں بہت بڑھ گئی تھیں، قوائے جسمانی اور طبیعتیں کمزور اور سہولت پسند واقع ہوئی تھیں، اور اس سب پر مستزاد یہ کہ تصوف اور سلوک سے ایک طرح کی وحشت اور خوف اور بعض تعلیم یافتہ طبقوں میں انکار کا رجحان پایا جاتا تھا، اس سب کا تقاضہ تھا کہ جو شخص اس زمانہ میں اصلاح و تربیت اور اس ''طب نبوی'' کی اشاعت و حفاظت کے لئے منتخب ہو وہ ان تمام حقائق سے واقف اور اس پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ اپنی مجتہدانہ صلاحیت سے اس علاج و معالجہ کو سہل، عمومی، ہر طبقہ کے لئے قابل عمل اور باعث کشش بنادے اور اس میں ایک ایسی نئی روح پھونک دے کہ اس کا مطب مرجع خاص و عام بن جائے اور وہاں صرف دوا سے نہیں بلکہ غذا سے بھی، شدید پرہیز سے نہیں بلکہ وسعت و رعایت سے بھی، قیمتی مرکبات سے نہیں بلکہ روز مرہ کے مفروات اور پیش یا افتادہ چیزوں سے بھی پیچیدہ امراض کا علاج ہوتا ہو اس کو انسانی نفسیات و طبائع اور مرض و مریض کے تغیرات کا ایسا وسیع علم اور تشخیص و تجویز کا ایسا ملکۂ راسخ عطا ہو کہ وہ چٹکیوں میں بڑے بڑے مریضوں کا علاج کر دیتا ہو، یہ حکیم الامت کے مطب کی خصوصیات ہیں جن کی تصدیق تربیۃ السالک، امداد السلوک وغیرہ کے صفحات اور حکیم الامت کے مکتوبات سے بخوبی ہو سکتی ہے[1]۔

صوفیاء کرام جنہوں نے اپنے مریدین کی اور جو لوگ ان کی طرف رجوع

---

[1] پیش لفظ سلوک سلیمانی۔ ص ۴۲، ۴۵۔

کرتے تھے ان کے نفوس کی اصلاح وتربیت کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کو تہذیب واخلاق اور اصلاح باطن کا ایک فن بنا دیا، ان حضرات کی تعداد خدا کے فضل سے اتنی بڑی ہے کہ ان کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثال کے طور پر سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبند اور خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

پھر ان کے بعد انہوں نے فن سلوک کا کام کیا اپنے زمانہ کی پھیلی ہوئی بدعتوں کو اور تحریفات کو انہوں نے دور کیا اور اپنے زمانہ کی طبیعتوں کا لحاظ کر کے انہوں نے طب نبوی ﷺ کی تجدید کی، ان میں سے خاص طور پر حضرت شیخ امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا اشرف علی تھانوی وہ حضرات ہیں جنہوں نے فن سلوک کی تجدید کا کام انجام دیا، اور اپنے زمانہ کے مطابق ان کے بنایا اور ان کو فائدہ کو عام کیا۔[1]

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے ملفوظات ومجالس کی ایک خصوصیت

بزرگوں کے ملفوظات اور ان کی مجالس قلم بند کرنے کا سلسلہ ہندوستان میں بہت قدیم ہے، یہ ایک بڑا مبارک اور نہایت دانشمندانہ تصنیفی اقدام تھا ان ملفوظات ومجالس میں جو زندگی وبے ساختگی پائی جاتی ہے وہ قدرتی طور پر علمی تصنیفات اور عام تحریرات میں نہیں ملتی۔ ان سے جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس کی توقع بھی لگے بندھے طریقے پر لکھی ہوئی کتابوں سے نہیں کی جاسکتی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی ذات کو مستثنیٰ کر کے اکثر معاصر معصر بزرگوں کے ملفوظات اور ان کی نادر تحقیقات تلف ہوگئیں۔[2]

---

[1] خطبات علی میاں، ج:۶ ص:۱۹۶ [2] پیش لفظ صحبتے با اہل دل ص ۵۶۔

حضرت تھانویؒ کے علوم معارف وحقائق کونئی نسل کے لئے جدید اسلوب میں مرتب کرنے کی ضرورت کا احساس

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کا ذکر خیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اگر وہ ان حقائق کوبھی جوان کومولانا تھانویؒ کی صحبت یا ان کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوئے تھے دبستان شبلی ہی کی زبان میں ادا کرتے تو اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے جس کے لئے وہ کتابیں لکھتے تھے زیادہ مفید ہوتا، اور نوجوانوں کا وہ طبقہ اور ملک کا دانشور حلقہ دین سے زیادہ آشنا اور قریب ہوتا''[1]

تکوینی نظام اور اللہ رب العالمین کی خاص حکمت ورحمت

یہ بھی اللہ تعالیٰ کے خاص حکمت ورحمت کا کرشمہ تھا کہ حضرت مرحوم کو اپنے آخری دور میں دو ایسے شارح وترجمان اور ان کے طریقہ علاج اور ان کے ذوق ومزاج کے دو ایسے رمزشناس ملے جنہوں نے حضرت کے مضامین عالیہ اور نکات وتحقیقات کو اس دور کی نئی اور علمی وادبی پیرائیہ بیان میں ادا کرنے کی خدمت انجام دیا، اس کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے زیادہ قابل فہم اور قابل استفادہ بنا دیا اس حیثیت سے بھی مولانا مرحوم اپنے معاصرین میں امتیازی شان رکھتے ہیں کہ ان کو ایسے بنے بنائے کہنہ مشق اور صاحب طرز مصنف واہل قلم مل گئے جو قسمت ہی سے کسی کو ہاتھ آتے ہیں میری مراد مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا سید سلیمان صاحب ندوی سے ہے۔ اول الذکر نے تجدید تصوف وسلوک کی کتابیں لکھ کر اور ثانی الذکر نے اپنے مکاتیب اصلاح وتربیت اور چند نہایت

---

[1] پرانے چراغ ج۲ ص۱۲۳۔

باصلاحیت صاحب قلم اور مخلص مریدوں کو تیار کر کے، (جن میں مولوی غلام محمد صاحب حیدر آبادی بی، اے اور اس کتاب کے مصنف مولانا محمد اشرف خانصاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں) مولانا کے اس طرز اصلاح اور تجدید تصوف وسلوک کو اور زیادہ مقبول ومقاصد سے مانوس کرنے میں مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی کے مضامین اوران کی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کا بھی بڑا حصہ ہے۔

---

[1] پیش لفظ سلوک سلیمانی ص ۴۵ ج ا۔
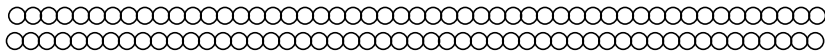
باب ۵

اہل مدارس علماء وطلباء کے لئے

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تصانیف، ملفوظات ومواعظ سے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی خاص ہدایت

الحمد الله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام سیدالمرسلین
وخاتم النبیین محمد وآلہٖ وصحبہٖ اجمعین ومن تبعهم
باحسان ودعابدعوۃ ربهم الیٰ یوم الدین

امابعد! میرے رفقاء کار، اساتذہ دارالعلوم برادران عزیز اورفرزندان عزیز!

میں مختصر وقت میں چند ضروری اور وداعی باتیں کرنا چاہتا ہوں! یوں تو وقت کا کوئی اعتبار نہیں لیکن چونکہ یہ الوداعی جلسہ ہے اس لئے آپ سے وہی باتیں کروں گا جو میرے اپنے عقیدے اور اپنے تجربے اور مطالعہ کے لحاظ سے ہیں اور میں جن کو آپ کے لئے مفید سمجھتا ہوں، آپ کی محبت آپ کا میرے اوپر حق کے سوا کوئی دوسرا محرک نہیں ہے (ان باتوں کو) سرسری نہ سمجھئے گا یہ ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ اگرچہ خودستائی ہے اور اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے محض اپنی بات میں اہمیت پیدا کرنے کے لئے کہتا ہوں کہ بہت کم لوگوں کو علماء سلف اور علماء معاصرین اور درمیانی دور کے علماء خاص طور پر ہندوستان کے علماء کے تراجم پڑھنے کا موقع ملا ہوگا جتنا مجھے ملا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی خدمت میں رہنے کا موقع بھی نصیب فرمایا۔

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست ہو، کسی درجہ میں تقویٰ، دیانت داری اور تعلق مع اللہ ہو یا اس کی فکر ہو، یہ ایسی بنیادی بات ہے کہ جس

کے بغیر نہ کسی کام میں برکت ہوتی ہے نہ حرکت اور اس کا حقیقی نفع اسی وقت ہوگا جب خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ معاملہ درست ہو۔

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب کے سب شب بیدار بن جائیں صوفی اور عارف باللہ ہو جائیں یہ ہر شخص کے لئے ضروری نہیں۔ لیکن جو ضروری حصہ ہے وہ یہ ہے کہ ایک حد تک تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ صحیح ہو اور اس کی فکر ہو۔ اور اپنی نمازوں کی فکر ہو دعا کا ذوق ہو اور انابت الی اللہ کسی نہ کسی درجہ میں ضرور ہو۔ یہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے اسے کبھی بھولنا نہیں چاہئے۔ اور اس کے حصول کے بہت سے ذرائع ہیں ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ کتاب وسنت اور فقہ کا مطالعہ کریں اور اس کے مطابق اپنی نمازوں کو بہتر بنانے کی کوشش کریں اس کے علاوہ سب سے مؤثر چیز یہ ہے کہ بزرگان دین کے حالات پڑھیں اور اگر اللہ تعالیٰ نصیب کرے تو کسی بزرگ کی صحبت اختیار کریں، میں بے تکلف کہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں سب سے بہتر اور مفید حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابیں خاص طور سے ان کے ملفوظات ومواعظ ایک اچھا اثر رکھتے ہیں میں نے الحمد اللہ ساری ندویت، اپنے تمام ادبی ذوق اور تاریخی بلکہ انتقادی ذوق کیساتھ ان سے فائدہ اٹھایا ہے اور آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں اس سے آپ کو اپنی جاہ طلبی، حب مال اور معاملات میں کوتاہی کا علم ہوگا۔ اور خاص طور پر اخلاق کی اصلاح اجتماعی کاموں کی اہمیت پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر ان سے یہ کام لیا ہے آپ اس کی طرف ضرور توجہ دیں آپ کے اندر اس کی کوئی مقدار ضرور ہونی چاہئے۔

یہ باتیں ہیں جن کو میں شاید زیادہ مؤثر طریقہ سے نہ کہہ سکا لیکن آپ انہیں حقائق سمجھیں، اور یہ مطالعہ اور تجربہ کا ماحصل ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان باتوں تک پہونچا ہوں اور آپ تک بطور امانت اور وصیت منتقل کرتا ہوں[1]

---

[1] اپنے کو نیلامی کی منڈی میں نہ پیش کیجئے ص ۱۴، ۱۵، تعمیر حیات ۲۵/ مارچ ۱۹۸۸ء۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی تصانیف اور ملفوظات ومواعظ سے متعلق عمومی ہدایت ونصیحت

(۱) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت میں چند مخصوص مہمان شیخ عبدالواحد الجزائری کی معیت میں تشریف لائے تھے، حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں۔

"بھائی عبدالواحد الجزائری نے کہا اپنے رفقاء کے لئے، کچھ ان سے کہہ دیجئے جس پر یہ عمل کریں جس سے روحانی ترقی کرسکیں اللہ تعالی سے تعلق دین سے تعلق پیدا ہو، (اس لئے) چند باتیں جو تقریر کے طور پر ہیں یہ نہ کوئی خاص تحقیق ہے نہ علمی مضمون ہے بلکہ ایک علمی ضابطہ کے طور پر ترجمان اور نمائندہ ہیں، اس میں دو تین اہم باتیں ہیں جو علمی ہیں روزمرہ کی ہیں بتاتے ہیں۔

ایک چیز جس سے لوگ بہت غافل ہیں تصحیح نیت ہے، یہ ولایت کا راستہ ہے جس کو ہم بتارہے ہیں، ....دوسری بات یہ کہ کسی کتاب کا مطالعہ سب سے بہتر کتاب ان میں ہے، "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" ابن قیم کی، اس کے علاوہ اور بھی کتابیں...... حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی کتابیں ہیں، ہماری کتاب "دستور حیات" ہے، تو انہیں دیکھا جائے پڑھا جائے[۱]

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنے مریدین ومتعلقین اور سلسلہ میں داخل ہونے والوں اور ہونے والیوں کے لئے مفید ہدایات ومشورے دیتے ہوئے "سلاسل اربعہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

(۲) سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے اور اس بات کا

---

[۱] ماخوذ از خطبات علی میاں، ص:۲۷۲ ج:۷۔

اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں جلانے مارنے صحت اور شفاء دینے، اولاد دینے روزی دینے اور قسمت اچھی بری کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جاسکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جاسکتا ہے، اس کے لئے جو لوگ اردو پڑھ سکتے ہیں وہ........علماء حق خصوصاً مولانا اشرف علی تھانویؒ وغیرہ کی کتابیں اور رسائل پڑھیں۔(ص:۵)

(۳) زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنے اور صحیح مقاصد زندگی معلوم کرنے کے لئے ......حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے مواعظ وملفوظات کا مطالعہ کیا جائے۔[1]

(۴) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ خطاب عام میں ایک تقریر میں فرماتے ہیں:

"بعض گناہ ایسے ہیں، جن سے وبائیں پیدا ہوتی ہیں، بعض گناہ ایسے ہیں، جس میں رزق میں برکت اٹھ جاتی ہے، بعض گناہ ایسے ہیں، ان سے موتیں جلدی ہونے لگتی ہیں، زندگیاں کم ہوتی ہیں، حضرت تھانوی قدس سرہٗ کا رسالہ دیکھئے "جزاء الأعمال" اس میں دیکھئے کہ کن کن اعمال پر کیا کیا اثرات شریعت کی طرف سے بتائے گئے ہیں کہ اس کی یہ نحوست، آج دیکھ رہے ہیں ہم دنیا میں، اس پر ہمارا ایمان ہے"[2]

---

[1] سلاسل اربعہ، ص ۶ [2] تحفۂ دین ودانش ص ۱۰۹۔

باب ۶

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری

(خلیفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ)

اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا باہمی ربط

مولانا علی میاں صاحبؒ کی حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے پہلی ملاقات

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ "پرانے چراغ" میں تحریر فرماتے ہیں:

فروری ۱۹۵۴ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میرا مئو ضلع اعظم گڑھ میں جہاں ایک تبلیغی دورہ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ پہنچنا ہوا تھا، میں نے مولانا وصی اللہ صاحب فتحپوری کی زیارت کے لئے مولانا کے وطن و مستقر فتحپور تال نرجا حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا خوش قسمتی سے مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب نے جن پر مولانا کی اس زمانہ میں خصوصی نظر عنایت تھی میری رفاقت ورہبری منظور فرمالی، اس وقت تک مولانا کی زیارت ہی زیارت ہوئی تھی، شاید پہلی بار اپنے محلّہ کی مسجد میں اور ایک دو بار مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھنؤ کی مجالس میں مولانا کو دیکھا تھا، مگر وہ دیکھنا نہ دیکھنا برابر تھا، نہ گفتگو کی نوبت آئی نہ پاس بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مولانا ہمارے بزرگوں سے اچھی طرح واقف تھے، اعظم گڑھ کے تمام قصبات و دیہات جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ پھر ان کے معنوی جانشین مولانا سید خواجہ احمد نصیر آبادی اور آخر میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادی کی دعوت و اصلاح کی کوششوں سے واقف اور ان کے معتقد وحلقہ بگوش ہیں، بالعموم سید احمد صاحب کو بڑے سید صاحب کے نام سے اور مولانا سید محمد امین صاحب کو چھوٹے سید ساحب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مولانا وصی اللہ صاحب کو

بھی ہمیشہ اسی طرح ذکر کرتے سنا، مولانا کے ایک عزیز قریب نے والد صاحب مرحوم سے طب پڑھی تھی، اور ان کے مطب میں بیٹھتے تھے، وہ مزید واقفیت و تعلق کا ذریعہ بنے ہوں گے، بھائی صاحب مرحوم سے بھی مولانا کو اچھا خاصا تعلق اور موانست تھی اور غالباً انہیں سے ملنے کے لئے ایک بار ہماری مسجد میں تشریف لائے تھے، بحیثیت طبیب کے بھی ان کی طرف رجوع فرمایا ہوگا، وہ میری نوعمری اور طالب علمی کا زمانہ تھا، نہ میں مولانا کے مقام و مرتبہ سے واقف تھا، نہ ان کو میری طرف خصوصی توجہ کرنے کا اس وقت کوئی سبب تھا، اس لئے اصل زیارت و ملاقات کہنا چاہئے کہ اسی سفر میں ہوئی۔

خانقاہ میں حاضری

نکلتے جاڑے تھے، ہم لوگ ایک یکہ پر مئو سے کوپا گنج گئے اور وہاں سے فتحپور کا رخ کیا، میرے ساتھ ایک رفیق سفر مولوی اشرف علی لکھنوی تھے، دوپہر کا کھانا ہو چکا تھا، اور لوگ قیلولہ کے لئے لیٹ چکے تھے کہ ہم لوگ فتحپور پہنچے، مولانا کو اسی وقت خبر ہوگئی، میرے نام سے غائبانہ طریقہ پر واقف تھے، اسی وقت بالا خانہ سے نیچے تشریف لے آئے اور نہایت شفقت کے ساتھ مجھے اوپر لے گئے، دیر تک از راہ شفقت میرا ہاتھ پکڑ کر دباتے رہے، اور یہ مولانا کی خاص ادا تھی، پھر اسی وقت کھانا گرم کروایا، دسترخوان بچھوایا، مجھے اس طرح کھلایا جیسے مائیں پاس بیٹھ کر بچوں کو کھلاتی ہیں، کبھی کبھی لقمہ بنا کر میرے منھ میں دیتے، مجھے حیرت تھی کہ میری بے کمالی اور اپنی بلند مقامی کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں ایسی غیر معمولی شفقت کیوں؟

کھانے سے فارغ ہو کر میں نیچے آ گیا، اور اس خانقاہ میں ٹھہر گیا جو مولانا کے دولت خانہ کے مقابل تھی، یہ ایک پختہ عمارت تھی، جو کسی بڑے مدرسہ کا دار الاقامہ معلوم ہوتا تھا، غالباً دو منزلہ عمارت تھی اور نئی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس وقت محترم حاجی نثار اللہ صاحب رئیس گورکھپور، سابق ایم، ایل، سی، جو مولانا کے مسترشدین اور محبین خاص

میں سے تھے، خانقاہ میں مقیم تھے، ان سے اچھا لطف صحبت رہا، وہ بڑے دیندار اور باذوق انسان تھے، اور ان سے پہلے سے نیاز حاصل تھا، ایک شب خانقاہ میں قیام رہا، اگلے دن وہاں سے واپسی ہوگئی، لیکن اس غیر معمولی برتاؤ اور شفقت بزرگانہ کا اثر مہینوں باقی رہا۔

یہ پہلا تخم محبت وعقیدت تھا، جو مولانا ہی کے وطن میں دل کی سرزمین میں ڈالا گیا، اور بارآور ہوا۔ ''وَالْبَلَدَ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ'' یہ بھی یاد ہے کہ ایک مجلس میں مولانا نے حاجی نثار اللہ صاحب یا کسی حاضر باش سے دریافت فرمایا کہ جانتے ہو کہ مشہور مصرعہ

مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

کا پہلا مصرعہ کیا ہے؟ لوگوں نے سکوت کیا تو فرمایا کہ :

مستی کے لئے بوئے مئے تند ہے کافی
مے خانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

میں اس کو اپنے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں کہ کیا عجب ہے کہ یہ اس عابرانہ بلکہ طائرانہ حاضری کی طرف اشارہ ہو، واپسی پر مولوی حکیم حبیب اللہ صاحب کو ۹/ جمادی الثانی ۱۳۷۳ھ (۱۱/ فروری ۱۹۵۴ء) کو جو خط لکھا اس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''فتحپور کا مبارک اور پر لطف سفر برسوں نہ بھولے گا، آتے جاتے آپ کی مخلصانہ ومحبانہ ادائیں اور فتحپور میں حضرت والا دامت برکاتہم کی بزرگانہ شفقتیں اور نوازشیں اب بھی یاد آتی رہتی ہیں، اور دل میں چٹکیاں لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ پھر وہ پر مسرت لمحات نصیب فرمائے، اور آپ کی معیت میں فتحپور کا سفر نصیب ہو۔''

اس درمیان میں دو گھنٹے کے لئے دوبارہ اپنے مخدوم ومحترم دوست صوفی عبد الرب صاحب کی معیت میں فتحپور حاضری نصیب ہوئی، صوفی صاحب کے فرزند اکبر میاں خالد عمر ایم، ایس، سی سلمہ حال انجینئر جدہ کی مختصر سی بارات ساتھ تھی، مولانا نے ان کا نکاح اپنے دوسرے خادم ومحبّ مولانا امجد صاحب رئیس گورکھپور کی صاحبزادی سے پڑھایا اور ہم لوگ رخصت ہوئے اسی سفر میں مولانا نے خصوصی شفقت فرمائی، اور مجھے

اپنے پاس ہی چار پائی پر بٹھایا، اس کے بعد عرصہ تک نہ ملاقات کی نوبت آئی نہ مکاتبت کا شرف حاصل ہوا، سب سے پہلا عریضہ ۱۳/ رمضان ۱۳۷۴ھ کو لکھا جس میں اس ماہ مبارک میں دعا کی خصوصی درخواست تھی، مولانا نے اس کا بڑی شفقت سے جواب دیا اور تحریر فرمایا کہ ''امتثالا للامر دعا کرتا ہوں، اللہ تعالی اپنی طلب صادق عطا فرمائے اور آپ کو اپنے مخلصین میں شامل فرمائے، آپ سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے، اس کے بعد حضرت خواجہ محمد معصوم کے مکتوبات میں سے مکتوب بست ودوم کا ایک نہایت مؤثر مضمون نقل فرمایا کہ جس میں ماسوی اللہ سے انقطاع کلی اور عشق مولا میں اپنے نفس کو بلکہ سارے جہاں کو خیر باد کہہ دینے کی تلقین تھی۔

گورکھپور میں حاضری

اس کے بعد سے مکاتبت کا سلسلہ جاری ہو گیا، جس میں طویل طویل وقفے بھی ہوتے رہے، اپنے خطوط میں دعا کی درخواست اور محبت ومناسبت کا ذکر اور حضرت کے گرامی نامہ میں شفقت وخصوصیت کا اظہار ہوتا رہا، اس کے بعد ایک مرتبہ گورکھپور میں حاضری ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ فتحپور سے دل برداشتہ بلکہ آزردہ ہو کر گورکھپور تشریف لے آئے تھے، اور حاجی نثار اللہ صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے،[1] وہیں حاضری ہوئی، علالت کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری تھا، اس لئے ملنے ملانے میں کچھ پابندیاں تھیں لیکن مجھے طلب فرمالیا گیا، اور نہایت شفقت فرمائی، جمعہ کی نماز کے لئے بھی میرے ساتھ ایک ہی رکشہ پر بیٹھ کر تشریف لے گئے، گورکھپور سے واپس آ کر میں نے ایک عریضہ لکھا جس میں ان شفقتوں اور خورد نوازی کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سعدی کا مشہور مصرعہ بھی لکھ دیا کہ ؎

کلاہ گوشہ دہقاں بآفتاب رسید

---

[1] مولانا ۷/ رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ کو فتحپور سے گورکھپور تشریف لے گئے وہاں ڈیڑھ سال قیام رہا، ۲/ ربیع الثانی ۱۳۷۷ھ کو الہ آباد تشریف لائے اور آخر تک وہیں قیام رہا۔

اس خط کے ساتھ میں نے اپنی نوتصنیف کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کا پہلا حصہ بھی اس تمہید وتقریب کے ساتھ بھیجا کہ جناب والا نے ایک مجلس میں فرمایا تھا کہ ''بیماری میں ہر چیز سے یہاں تک کہ گفتگو کرنے سے بھی طبیعت برداشتہ ہوجاتی ہے، ایسی حالت میں جی چاہتا ہے کہ کوئی اور گفتگو کرے اور ہم سنیں........میں نے اس کا ایک بدل تجویز کیا ہے کہ اپنی ایک حقیر تصنیف ''تاریخ دعوت وعزیمت'' پیش خدمت کروں، اور وہ کبھی کبھی حضرت کی مجلس میں پڑھ کر سنادی جائے، اس کی جرأت اس لئے بھی ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین سے جو اکابر کے کلام وتالیفات سے ماخوذ ہیں حضرت کے اذواق وارشادات کی تائید ہوتی ہے''۔

مولانا نے سعدی کے مصرعہ کا ایسا جواب دیا جس نے الٹا شرمندہ کیا تحریر فرمایا کہ:

اس کا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں اسے پڑھتا، کیوں کہ ایک بادشاہ نے کسی دہقاں کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا، تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک دہقاں کے یہاں بھی نزول فرما کر اس کو شرف بخشا، اسی لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں ۔

''کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید''

بلکہ پورے قطعہ ہی کو دہراتا ہوں کہ ۔

زقدر وشوکت سلطاں نگشت چیزے کم
التفات بمہاں سرائے دہقانے
کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید
کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

پھر کتاب کی پیشکش کے متعلق ایسی بات تحریر فرمائی جس سے اپنی غلطی پر تنبہ اور ندامت ہوئی، اور مولانا کی مصلحانہ شان اور دیدہ وری کا اظہار ہوا، تحریر فرمایا گیا کہ:

''اور آپ نے اپنی بعض تصانیف کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مرض کی وجہ سے گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مجلس میں اس کو پڑھ کر سنایا جائے تا کہ تفریح طبع کا ذریعہ ہو سکے، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ اس کے مضامین ارشادی ہیں جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا تو میں ارشادی مضامین کو تفریح کا سبب نہیں بناؤں گا، کیوں کہ یہ اس کی ناقدری ہوگی بلکہ میں یہ کروں گا کہ اس کا از خود مطالعہ کروں گا، اور جس طرح سے بزرگوں کے اقوال سے اثنائے گفتگو میں استدلال کرتا ہوں اسی طرح اس کے مضامین کو بھی لوگوں کے سامنے پیش کروں گا۔ لیکن یہ سب کچھ ابھی نہیں بلکہ معتد بہ قوت کے بعد کروں گا''۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مولانا گورکھپور سے الہ آباد تشریف لے آئے اور الہ آباد کیا تشریف لائے، الہ آباد اور الہ آباد والوں کی قسمت جاگی اور وہ شہر جو عرصہ دراز تک تصوف و معرفت کا مرکز رہ چکا تھا، اور یہاں کے بارہ دائرے مشہور تھے، اب ذکر اللہ اور دعوت الی اللہ کی برکت سے اسم با مسمیٰ اور صحیح معنی میں الہ آباد ہو گیا، مولانا گورکھپور سے ربیع الثانی ۷۷ھ میں الہ آباد تشریف لائے کچھ عرصہ حسن منزل میں قیام رہا، پھر روشن باغ کا محلّہ آپ کے قیام سے منور و روشن ہوا اور وہاں ایک خانقاہ اور دار التربیت قائم ہو گیا۔

الہ آباد میں حاضری اور مجالس میں شرکت

اسی زمانہ میں محبّ محترم مولوی شاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے انجمن اصلاح المسلمین کے جلسہ میں تقریر کے لئے مدعو کیا جو بڑے دھوم دھام سے ہر سال الہ آباد میں ہوا کرتا تھا، خاں صاحب کئی سال سے مدعو فرما رہے تھے، لیکن چونکہ میرا معمول جلسوں میں بہت کم جانے کا تھا، برابر معذرت کرتا رہا، اس مرتبہ اس میں ایک دوسری کشش شامل ہو گئی، یہ مولانا کی موجودگی تھی، جلسہ کا تو ایک بہانہ تھا، میں نے الہ آباد کا قصد کر لیا کہ مولانا کی خدمت میں حاضری اور کچھ وقت گذارنے کا موقع مل جائے گا، مولانا نے حسب معمول

نہایت شفقت فرمائی، مجالس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی، جو اس سفر کی اصل قیمت تھی، اس وقت ذرا قریب سے اور کچھ زیادہ غور سے مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک اضطرابی و سیمابی کیفیت تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی کل چین نہیں، مسلمانوں کے حالات، اخلاق و معاملات کے بگاڑ، صدق و اخلاص کی کمی اور نفاق کے کھلی آنکھوں مشاہدے نے بے قرار و مضطرب بنا رکھا ہے، اصلاح حال او دعوت فرار الی اللہ کا جذبہ قلب و دماغ واعصاب پر مستولی ہو گیا ہے، اور وہ حال ہے جو اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔

شعلہا آخر ز ہر مویم دمید
از رگ اندیشہ ام آتش چکید

مولانا کی اس بے قراری و سیماب وشی کو دیکھ کر بے اختیار مولانا محمد الیاس صاحب یاد آ گئے، وہی نحیف جثہ وہی گفتگو میں تکلفات، انداز خطابت سے بے نیازی، وہی موسوی رنگ کہ زبان سینہ کے جوش اور دل کا ساتھ نہ دے سکے، وہی دعوت کا غلبہ وہی فکر میں ڈوبا ہوا سکوت، وہی اضطراب سے لبریز تکلم، دعوت کے موضوع کا ضرور فرق تھا، لیکن اپنے موضوع سے عشق اور اپنے کام کی فکر کا وہی حال تھا، صبح اور شام کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا، ایسے جذب کی کیفیت تھی، جس پر عقل و سلوک کے پہرے بیٹھے ہوئے تھے، کبھی کبھی بعض مخلص خادموں کے سر پکڑ کر ہلاتے اور ان کو کسی نکتہ یا ضرورت کی طرف متوجہ فرماتے۔

الہ آباد کی مجالس میں خاص طور پر تذکیر بالآخرت اور نعمائے جنت و عذاب جہنم کی ترغیب و ترہیب پر خاص طور پر زور تھا، اور یہ کہ قرآن مجید کا اسلوب اور طریقہ موعظت سب سے زیادہ مفید اور مؤثر ہے، نیز یہ کہ علماء اور واعظین نے آخرت کے مضمون اور جنت و دوزخ کے تذکرہ کو بالکل فراموش و نظر انداز کر دیا ہے، اور ان کو اس سے شرم آنے لگی ہے، گویا وہ ایک خلاف فیشن بات ہے، الہ آباد سے واپسی پر ۲۵؍ شوال ۱۳۷۷ھ کو لکھنؤ پہنچ کر

جو عریضہ لکھا اس میں انہیں تاثرات کا اظہار تھا، خاص طور پر اس غیر معمولی شفقت پر اپنے گہرے تاثرات وتشکر کا اظہار کیا گیا تھا جو اس دوروزہ قیام میں دیکھنے میں آئی، مولانا نے اس کا جو جواب دیا وہ میرے لئے سرمایہ سعادت ہے، وہ یہاں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

حبیبی ومحبی سلمہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ نے شرف صدور بخشا، باعث ازدیاد محبت وخلوص ہوا جو حضرات اہل علم میرے پاس آمدورفت فرماتے ہیں، ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے، ارقام فرمایا کہ جس اہم ومبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی، ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظرانداز کردیا ہے، اس کو سن کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کردیا
ہم صفیر وتم نے پھر ذکر گلستاں کردیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی بعد آنے اجازت نامہ کے قدرے تفصیل سے عرض کروں گا۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

اس حاضری اور تاثر وتحریک کا نتیجہ مولانا کا وہ بیش قیمت مضمون ''التذکیر بالقرآن'' تھا جو میری واپسی کے بعد سپرد قلم فرمایا گیا اور ''الفرقان'' اور دوسرے رسالہ میں شائع ہوا اور علیحدہ کتابی شکل میں چھپ گیا، یہ مضمون باوجود عبارت آرائی اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت مؤثر اور مفید ہے، اس کے بعد غالباً ایک بار اور اصلاح المسلمین کے جلسہ میں اور حقیقتاً مولانا کی مجالس میں شرکت اور استفادہ کے لئے الہ آباد جانا ہوا، قیام تمام تر مولانا کے دولتخانہ پر رہا، مجالس اور حلقہ افادہ واستفادہ کا وہی معمول تھا

جو پہلے دیکھنے میں آیا تھا، یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ شہر کے ذی علم وفہیم حضرات حاضری دیتے ہیں، اور اس کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

الہ آباد سفر کا ایک واقعہ

اس کے بعد پھر ایک بار جون ۱۹۶۴ء میں الہ آباد حاضری ہوئی، تقریب حاضری یہ تھی کہ ۲۰/۲۱/ جون کو دینی تعلیم کونسل ''جس کی صدارت کا شرف شروع سے حاصل رہا'' کی الہ آباد میں صوبائی کانفرنس تھی، اس کا پہلے سے قصد تھا کہ قیام مولانا ہی کے یہاں رہے گا، غلطی سے مولانا کو اپنی آمد اور پہنچنے کے وقت کی اطلاع دیدی، غلطی اس لئے کہ جب ۲۰/ جون کو صبح الہ آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو معلوم ہوا کہ مولانا خود اسٹیشن تشریف لائے ہیں، گاڑی ذرا تاخیر سے پہنچی تھی، مولانا نے ملتے ہی فرمایا کہ اس خیال سے کہ وہ وقت چائے اور ناشتہ کا ہوگا میں چائے اور ناشتہ اسٹیشن پر لایا ہوں کہ تاخیر نہ ہو، لیکن اب تو وقت زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے اب گھر ہی پر ناشتہ ہو جائے گا میں اس لطف و کرم اور اہتمام کو دیکھ کر پانی پانی ہوگیا، اور اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ پہنچنے کے وقت کی اطلاع کیوں دی، اس سفر میں محبی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، برادرم مولوی سید ابو بکر صاحب حسنی ایم۔اے (حال استاذ نہرو یونیورسٹی دہلی) جو مولانا کی زیارت وملاقات کے بڑے مشتاق تھے، اور عزیزی سید محمد مسلم حسنی بھی ساتھ تھے، ہم سب مولانا ہی کے مہمان رہے کیوں کہ شدید گرمی کا زمانہ تھا، اس لئے شب کا قیام ایک نوخرید مکان کے صحن میں رہا، مولانا نے ہماری راحت کا بڑا اہتمام فرمایا تھا، اس زمانہ قیام میں مولانا نے مسلمانوں کے حالات ومسائل سے اپنی گہری دلچسپی وفکر مندی کا بار بار اظہار فرمایا، بعض مرتبہ مولانا جامی صاحب یا مولانا سراج الحق صاحب کو خصوصی پیغام دے کر میرے پاس اس وقت بھیجا جب میں کانفرنس کے سلسلہ میں کسی کمیٹی یا مجلس کے مذاکرات میں شریک تھا۔

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کا تعمیر مساجد کا ذوق

مولانا کے قیام سے الہ آباد میں دینی رونق پیدا ہوگئی تھی، جس محلّہ میں قیام تھا اس مسجد کی توسیع کی ضرورت جلد پیش آ گئی، مدرسہ بھی قائم ہوگیا، اور مولانا کی برکت سے لوگوں میں اپنی اصلاح وتربیت کی طرف توجہ پیدا ہوگئی، مولانا کو مساجد کی تعمیر کا بڑا ذوق تھا، جہاں کچھ عرصہ قیام فرماتے وہاں ضرور کچھ نئی مساجد تعمیر ہوجاتیں، گورکھپور میں بھی ایسا ہی ہوا، اور الہ آباد کے اسٹیشن کے قریب کی مسجد جس کی بنیاد شاید پہلے پڑ چکی تھی، مولانا کے حسن توجہ سے تکمیل کو پہونچی اور اس کا شمار خوبصورت مسجدوں میں ہونے لگا۔

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کی غایت درجہ شفقت اور ایک کرامت

مولانا کے اس تعلق قلبی اور شفقت بزرگانہ کا پورا اظہار اس وقت ہوا، جب میں اپنی آنکھ کی تکلیف کے سلسلہ میں ۶۷ء میں سیتاپور میں مقیم تھا، اور یکے بعد دیگرے آپریشن ہورہے تھے، کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا، اس وقت مولانا کے نامۂ وپیام برابر آتے تھے، الہ آباد سے مولانا کے اہل تعلق میں جو بھی آتا وہ بیان کرتا کہ مولانا بہت فکرمند اور بے چین ہیں، بعض اوقات لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ میں ان کی اس تکلیف میں کس طرح کمی کرسکتا ہوں، یہاں تک کہ قیام کے آخر زمانہ میں مولانا کا گرامی نامہ آیا کہ:

''میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو وہاں کے علاج سے فائدہ نہ ہوگا، آپ لکھنؤ جائیں اور ہومیو پیتھک علاج کریں''

میں اور میرے تیماردار بھی اس قیام سے عاجز آ گئے تھے یہ ایک اشارہ غیبی معلوم ہوا اور میں لکھنؤ آ گیا، اور مجبور ہوکر ایک ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے جو بہت زیادہ نامور

بھی نہ تھا رجوع کیا، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو تکلیف بار بار کے آپریشنوں سے بھی نہیں گئی تھی، وہ باذن اللہ ایک خوراک سے جاتی رہی، اور الحمد للہ پھر کبھی نہیں ہوئی، نام تو اس ڈاکٹر کا ہوگیا، اور اس معرکۃ الآرء علاج سے خود اس کو بہت فائدہ ہوا، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں دوا سے زیادہ دعا اور ایک مرد خدا کی اور بہت سے مخلصین کی سوز قلبی اور دردمندی کا ہاتھ تھا۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمت بر آہوئے چیں بستہ اند

اس تکلیف سے نجات پانے کے بعد میں نے الہ آباد کا مستقل سفر کیا، جس کا محرک محض جذبہ تشکر اور مولانا کی مسرت قلبی کی توقع تھی، گرمی کا زمانہ تھا، مولانا نے دولت خانہ کی نیچے کی منزل میں قیام کا انتظام فرمایا اور تاکید کی کہ گرمی میں اوپر آنے کی زحمت بالکل نہ کی جائے، اس کا بھی اہتمام کیا گیا کہ کسی ضرورت کے لئے باہر نہ نکلنا ہو، کئی بار انار شیریں کے دانے اس پیغام کے ساتھ بھیجے کہ یہ آنکھوں کے لئے مفید ہیں، پھر شام کو بڑی شفقت کے ساتھ ملاقات فرمائی، کھانے کا اہتمام فرمایا، ان نوازشوں میں محض بزرگانہ نہیں بلکہ مادرانہ شفقت کی جھلک بھی نظر آتی تھی، جو نائبین رسول کا امتیاز ہے "عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ".

ایک بار مجلس مشاورت کے جلسہ میں بھی جو الہ آباد میں ہونا طے پایا تھا الہ آباد جانا ہوا، مولانا ہی کے دولت خانہ پر قیام تھا، صدر مجلس ڈاکٹر سید محمود صاحب بھی تشریف لائے تھے، ڈاکٹر صاحب کو مولانا سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی تھی، اور کچھ ایسا بھی سنا جاتا تھا کہ وہ داخل سلسلہ بھی ہوگئے ہیں، مجلس کے بعض دوسرے قائدین بھی الہ آباد آئے ہوئے وہ بھی مولانا کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے، مولانا ابواللیث صاحب ندوی (امیر جماعت اسلامی) خاص طور سے حاضری کا اہتمام کرتے تھے اور مولانا بھی ان پر خصوصی شفقت فرماتے تھے۔

بمبئی کا سفر اور اہل بمبئی کی خوش نصیبی

اب وہ وقت آ گیا کہ مولانا کے لئے اپنے امراض وتکالیف بالخصوص مرض رعاف کی وجہ سے الہ آباد کی گرمیوں میں رہنا مشکل ہوگیا، اور معالجین نے معتدل آب وہوا کے کسی مقام پر گرمیاں وسردیاں گذارنے کا مشورہ دیا، اس علاج ومشورہ میں ہمارے شہر لکھنؤ کے نامور طبیب یونانی شفاء الملک مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب پیش پیش تھے، جن کو اپنی حذاقت نیز مناسبت وعقیدت کی وجہ سے مولانا کے خاص معتمد ومقرب بننے کا شرف حاصل ہوگیا تھا، اب بمبئی کی قسمت نے زور کیا، ظاہر بیں سمجھے کہ مولانا اپنے علاج کے لئے تشریف لے جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں اہل بمبئی کا علاج مقصود تھا، اور وہاں ایک روحانی مطب کھلنے کا قضاوقدر میں فیصلہ ہوگیا تھا، مولانا کی دل بستگی (جس کے ساتھ اہل بمبئی کی دل کشائی وابستہ تھی) بمبئی اور اہل بمبئی سے بڑھتی گئی اور اہل بمبئی کو بھی مولانا کی ذات سے گرویدگی اور عقیدت آناًفاناً ترقی کرتی گئی، سارے قرائن واسباب اس بات کے موید تھے کہ مولانا کی آمد اور قیام سے ہندوستان کے اس عظیم ترین شہر (جس کا مزاج ہمیشہ سے تجارتی اور کاروباری رہا ہے، اور جو کسی زمانہ میں مسلک دیوبند کے داعیوں اور علم برداروں کے لئے ارض ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا) کے ساکن سمندر کی سطح میں ادنی سا تموج وحرکت بھی پیدا نہ ہوگی، مولانا کے پاس ان اسلحہ اور وسائل میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ تھی جو بمبئی کے لوگوں کو متاثر اور گرویدہ کرسکتی، یعنی خطابت، ظاہری وجاہت، پروپیگنڈا اور ظاہری شان وشوکت وغیرہ۔

قضاوقدر کے فیصلے کسی ظاہری سبب اور وسیلہ کے پابند نہیں ہوتے

لیکن قضاوقدر کے فیصلے ان میں سے کسی چیز کے بھی تابع اور پابند نہیں لوگوں نے جو کچھ دیکھا، تمام تر قیاسات کے برخلاف تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی قوت کام کر

رہی ہے اور لوگوں کے دلوں اور روحوں کو ان کی طرف متوجہ کر رہی ہے، میں نے ان تاجروں اور بمبئی کے چوٹی کے کاروباری لوگوں کی عقیدت ورجوع دیکھا جو اس سے پہلے کسی دینی دعوت وتحریک سے متاثر نہیں ہوئے تھے، اور جو علمائے حق کی طرف (سے) شدید غلط فہمیوں اور بدگمانیوں میں مبتلا تھے، ان کا رجوع برابر بڑھتا گیا اور تیزی سے ان میں اصلاح وتغیر آنے لگا، دیکھتے دیکھتے ان کی صورت وسیرت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگیں، مجھے ۵۰ء سے بمبئی جانے کا برابر اتفاق ہوتا رہا اور اس میں مشکل سے کسی سال وقفہ ہوتا تھا لیکن اب مولانا کے قیام کے بعد جو بمبئی جانا ہوا تو وہاں کی حالت ہی دوسری دیکھی جن لوگوں کو مولانا کی مجلس میں دیکھنے کی بالکل امید نہ تھی، ان کو وہاں سر بہ زانو پایا حالانکہ یہاں کشش کے وہ سب اسباب مفقود تھے جو بمبئی کے لئے ضروری تھے،

تاثیر کے لئے خطابت والفاظ کی شرط نہیں

۱۹۶۷ء میں حجاز جاتے ہوئے چند روز بمبئی ٹھہرا، میں ایک دن صبح کرلا جہاں مولانا کا قیام رہتا تھا، ٹھیک صبح کے درس کے وقت پہونچا، مجھے مولانا کی کرسی کے پایہ کے پاس جگہ دی گئی، مولانا تشریف لائے میکروفون سامنے تھا، کچھ بیان فرمانا شروع کیا، درمیان میں تفسیر وحدیث کی کتابیں منگوا کر ان کی عبارتیں سناتے اور تقریر فرماتے، میں پایہ سے لگا بیٹھا ہوا تھا، مولانا کے لہجہ اور طرز کلام سے بھی مانوس تھا، لیکن میں خود بھی گفتگو کا خاصہ حصہ نہیں سمجھ سکا، لیکن دیکھتا تھا کہ لوگوں کے چہرے اور آنکھوں میں گہرا اثر ہے، کئی بار کی طرح اس موقع پر بھی اندازہ ہوا کہ تاثیر کے لئے خطابت والفاظ کی کوئی شرط نہیں۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ورنہ اس کے برخلاف بڑے بڑے شعلہ بیان مقرر تقریر کا سماں باندھ دیتے ہیں، لیکن نہ قلوب پر کوئی اثر ہوتا ہے، اور نہ زندگی میں کوئی انقلاب اس لئے کہ بقول جگرؔ

آنکھوں میں سرور عشق نہیں چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

اگر خدا کو منظور ہوتا اور مولانا کے سفر و قیام کا سلسلہ چند سال اور قائم رہتا تو شاید بمبئی میں خاصے وسیع پیمانہ پر دینی بیداری، اصلاح حال، اتباع سنت کا ذوق اور بیسیوں نہیں بلکہ سیکڑوں زندگیوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا، لیکن خدا کی حکمت اور اسرار الٰہی کو کوئی نہیں جانتا، نومبر ۱۹۶۷ء کو یہ سلسلہ خیر و برکت اچانک ختم ہو گیا، اور صرف بمبئی ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان اور عالم اسلام اس مبارک وجود سے محروم ہو گیا، جس نے مشائخ پیشیں اور مصلحین اولین کی یاد تازہ کر دی تھی، اور ثابت کر دیا تھا کہ اخلاص و درد اپنے کام کی دھن اور لگن اور روحانی قوت بڑے سے بڑے ناسازگار حالات اور سخت سے سخت مادہ زدہ اور ظاہر پرست دور اور ماحول میں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی ۔

جہانے را دگر گوں کرد یک مرد...... خدا آگاہے

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کا واقعہ

یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ مولانا کے قلب میں زیارت بیت اللہ اور کچھ عرصہ اس کے سایہ میں قیام کرنے کا جذبہ اور شوق اس طرح موجزن ہوا کہ کوئی طبی مصلحت اور اصلاحی ضرورت اس پر غالب نہ آسکی، مولانا نے حج کا عزم فرمالیا، اور اپنے خصوصی مخلصین کو بھی اس پر آمادہ فرمانا شروع کیا، یہ جذبہ اس قوت و شدت سے پیدا ہوا تھا کہ کوئی مشکل اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکی، ادھر خدا کی کچھ ایسی مدد ہوئی کہ موانع مرتفع ہوتے چلے گئے اور ہمرکابی کے لئے ایک اچھا خاصہ قافلہ تیار ہو گیا، میں اسی زمانہ میں رابطہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے سفر حجاز پر روانہ ہو رہا تھا، بمبئی میں جب بغرض ملاقات حاضر ہوا تو اپنے ارادہ کا جس کا عام طور پر اعلان نہیں ہوا تھا، ذکر فرمایا رخصت ہو کر جب موٹر پر آ کر بیٹھ گیا تو مولانا جامی صاحب کو یہ خصوصی پیغام دے کر بھیجا کہ واپسی میں عجلت نہ کیجئے گا، میرا انتظار کیجئے گا، لیکن میں بعض اسباب کی بنا پر زیادہ نہ ٹھہر سکا، اور

جلسہ سے فارغ ہو کر بمبئی واپس ہوا، وسط نومبر ۱۹۶۷ء کی غالباً ۱۹؍۲۰ تاریخ تھی، مولانا سے ملا اور عرض کیا کہ میں آ تو گیا ہوں، لیکن مجھے بعض اسباب کی بنا پر توقع ہے کہ میں رمضان المبارک میں حاضر ہوں گا، اور اس طرح کچھ عرصہ آپ کی خدمت میں وہاں رہنے کا موقع ملے گا، مولانا بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ضرور ضرور کوشش کرنا۔

واپسی کے سفر میں رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی بھی ساتھ تھے، مولانا کی روانگی سے ایک دو روز پیشتر ہم لوگ لکھنؤ روانہ ہونے والے تھے، ایک شام کو ایک معتقد کے یہاں جو ایک بڑے تاجر تھے، مولانا کی چائے کی دعوت تھی، ہم دونوں اور مولانا ابرار الحق صاحب بھی مدعو تھے، مولانا نے اپنے گدے پر دائیں اور بائیں اپنے قریب ہم دونوں کو بٹھایا پھر بڑی رازداری کے ساتھ لب مبارک کو میرے کان کے پاس لاکر فرمایا "دعا کرو کہ حاضری ہو جائے" میں اس جملہ کا مطلب بالکل نہیں سمجھا، کہ اب حاضری میں کیا تردد رہا، چند دن کا معاملہ ہے، لیکن بعد کے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز تھا اور تقدیر الٰہی کو وہاں .... حاضری کے بجائے کچھ اور منظور تھا، "وکان امر اللہ قدرا مقدورا"

روانگی چہار شنبہ کے روز ۲۲؍نومبر ۶۷ء کو ہوئی ابھی جہاز کو روانہ ہوئے دو ہی روز ہوئے تھے کہ ۲۴؍نومبر بعد نماز مغرب غشی کا دورہ پڑا، اسی شب میں چند گھنٹے کے بعد گیارہ بجے شب میں بیت کے بجائے رب البیت سے جا ملے، اور مکان کے بجائے مکیں سے واصل ہوئے، "اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجۡعٰی"۔

یہ خبر جب وائرلیس سے حجاز پہونچی تو وہاں کے مخلصین نے اور خود مدحت کامل صاحب سفیر ہند متعین سعودی عرب نے جنت المعلیٰ میں تدفین کے لئے حکومت سعودیہ کی منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی اور بالکل استثنائی طریقہ پر جسد مبارک کو البلد الامین لانے کی سرکاری طریقہ پر اجازت ملی، جنت المعلیٰ میں شیخ المشائخ

حضرت حاجی امداد اللہؒ صاحب مہاجر مکی کی لحد کی جگہ پر قبر تیار بھی کرلی گئی، اور مدرسہ صولتیہ میں غسل کی تیاری بھی شروع کردی گئی، لیکن یہاں بھی اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ رہا، اس غلط فہمی کی بناء پر کہ اجازت نہیں ہوئی ہے غسل و تکفین اور نماز جنازہ میں عجلت سے کام لیا گیا اور جسد مبارک جہاز کے قوانین کے مطابق سمندر میں اتار دیا گیا، سنا ہے کہ مولانا بمبئی سے رخصت ہونے سے پہلے بار بار یہ شعر پڑھتے تھے ع

پھول تربت پر میری ڈالوگے کیا
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی

یہ واقعہ جس طرح پیش آیا اس میں تدبیر کی بے بسی اور تقدیر کی قہاری صاف نمایاں تھی، تفصیل کا یہ موقع نہیں، "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ" اس طرح ان برگزیدہ افراد کی نورانی فہرست میں جن کے مدفن ہونے کا شرف بجائے آغوش خاک سمندر کے سینہ کو عطا کیا گیا، اور جن میں حضرت مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی مصنف "علم الصیغہ" اور تاریخ "حبیب الہٰ" اور قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف "رحمۃ للعالمین" جیسے صلحاء و مقبولین شامل ہیں، ایک اور مرد کامل کا اضافہ ہوا اور سمندر کو شکایت نہ رہی کہ وہ اس دولت سے یکسر محروم ہے، جو زمین کے نصیب میں آئی ہے۔[1]

---

[1] یہ پورا مضمون پرانے چراغ ص ۱۶۴ تا ۱۷۹ ج ۱ سے ماخوذ ہے سرخیاں مرتب کی قائم کردہ ہیں۔
(پرانے چراغ ص: ۱۶۴ تا ۱۷۹)

باب ۷

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد خانقاہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تقریر

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين محمد بن عبد الله الأمين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين.

حضرات! جن لوگوں کو کسی مدرسہ میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے یا وہ کسی بزرگ کی خدمت میں استفادہ اور تربیت کے لئے حاضر ہوئے ہیں ان کو اس کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ زمانہ خواہ کتنا ہی گذر جائے اس طالب علم کے لئے اپنے مدرسہ میں کھڑے ہو کر کچھ بیان کرنا یا اس جگہ جہاں وہ استفادہ کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا، کچھ عرض کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

میں بزرگوں کی خدمت میں کیوں جاتا تھا

میری مثال بالکل ایسی ہی ہے اس لئے کہ میں ہمیشہ اپنے بزرگوں کی خدمت میں اور خصوصاً اس آخری دور میں حضرت مولانا (شاہ وصی اللہ صاحبؒ) کی خدمت میں محض اس لئے آتا تھا کہ کوئی ایسی بات سننے میں آئے جس سے دل میں کچھ کیفیت پیدا ہو، یقین میں اضافہ ہو اور اس میں ایمانی حلاوت نصیب ہو، اور رسم وصورت میں حقیقت پیدا ہو۔

اہل علم و اہل کمال بھی بزرگوں کی صحبت و استفادہ سے مستغنی نہیں

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ کچھ لکھ پڑھ جاتے ہیں یا ان کو کچھ تصنیف و تالیف کا اتفاق ہوتا ہے اور ان کی طرف کچھ نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں کہ ہم بھی کچھ جانتے بوجھتے

ہیں تو پھراب ان کو کچھ سننے کی اور کہیں جانے کی اور کسی سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت نہیں تو ان کا یہ خیال بالکل صحیح نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی دور میں بھی اور کسی عمر میں بھی، گمنامی اور شہرت کی حالت میں بھی استفادہ سے بلکہ اصلاح سے مستغنی نہیں ہوتا، ہمہ شما کا تو خیر ذکر کیا ہے، جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی صحبت حاصل تھی، جس کو کیمیا اثر کہنا بھی حقیقت میں اس کی کچھ تعریف نہ ہوگی، بس یوں سمجھئے کہ ایسی پاک صحبت جس کے بعد کسی صحبت کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، اور کوئی صحبت اس سے بڑھ کر مؤثر نہیں ہوسکتی، مگر پھر بھی صحابۂ کرامؓ کو آپ کے بعد ہمیشہ اس بات کی فکر وطلب رہتی تھی کہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور ہمارے قلوب میں وہی سوز وگداز اور وہی کیفیات پیدا ہوں جو صحبت نبوی میں حاصل ہوا کرتی تھیں یا کم از کم اس کا اثر یا عکس ہی نصیب ہوجائے، چنانچہ بخاری شریف میں ایک جلیل القدر صحابی کا یہ قول امام بخاری نے نقل کیا ہے **اجلس بنا نؤمن ساعة**، آؤ بھائی تھوڑی دیر بیٹھ کر ذرا ایمان کی باتیں کرلیں، اور ایمان کا مزہ اٹھالیں، ایمان کے جھونکے آئیں اور ہم اس سے لطف اندوز ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو بعد والے کیوں کر اس سے مستغنی ہوسکتے ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے اور جن لوگوں کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ کہنے سننے سے آدمی کے قلب میں ضرور ایک بے کیفی سی پیدا ہوجاتی ہے اور اس میں کہنا سننے سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، سننے سے اتنی بے کیفی قلب میں نہیں پیدا ہوتی ہے جتنی کہنے سے ہوتی ہے، اس لئے ایسے لوگوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کبھی سامع ہوں قائل نہ ہوں اور کبھی صرف مستفید ہوں مفید نہ ہوں اور کبھی مخاطب ہوں مخاطِب نہ ہوں اور ہمہ تن گوش ہوکر کسی اللہ والے کی باتیں سنیں تاکہ قلب میں ایسا کیف پیدا ہو جس سے قلب کی زندگی ہے۔

محروم وبدقسمت انسان

غرض جن لوگوں کو ذرا بھی تجربہ ہے اور ان کے قلوب مردہ نہیں ہو چکے ہیں وہ خود جانتے ہیں کہ ان کو دوسروں سے ہزار درجہ زیادہ اپنے ایمان کو تازہ کرنے کی ضرورت ہے اور اللہ والوں کی بات ادب وتعظیم کے ساتھ سننے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ سمجھیں کہ ہم مستغنی ہیں یا ہم بھرے ہوئے ہیں تو ان سے زیادہ محروم وبدقسمت کوئی نہیں۔

بزرگوں کے یہاں حاضری دینے کا طریقہ

بزرگان دین نے اس کی ایسی مثال بیان فرمائی ہے کہ اگر کوئی فقیر اس طرح صدا لگائے کہ یوں تو میرے پاس سب کچھ ہے، ہمارا کشکول بھی بھرا ہوا ہے، پھر صدا لگاتا ہوں تو بڑے سے بڑے سخی کے اندر سخاوت کا جذبہ نہیں پیدا ہوگا، اس کے لئے تو اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے کو محتاج ظاہر کیا جائے۔

یہی حال اب یہاں بھی ہونا چاہئے ان حضرات کے یہاں اس طرح سے حاضر ہونا چاہئے کہ ہم بالکل خالی ہیں، مفلس ومحتاج بن کر آپ کی خدمت میں کچھ لینے کے لئے آئے ہیں۔ ع

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تو — شیئاً للہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما — آفریں بردست وبربازوئے تو

اہل اللہ کی خدمت میں حاضری کی ضرورت کا احساس

واقعہ یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ میں ایسے حضرات کی خدمت میں حاضری دوں، اور پھر ایسے دور میں اور ہمارے

جوار میں مولانا وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ شفقت کرنے والا نظر میں کوئی نہیں تھا، اور مناسبت کی بات تو بالکل غیر اختیاری ہے اس کے لئے کوئی معلوم اور متعین اصول نہیں ہیں کیوں ہوتی ہے؟ کب ہوتی ہے؟ کیسے ہوتی ہے؟ اس کے اصول تو کسی بڑے سے بڑے حکیم نے بھی نہیں بتائے تو مناسبت منجانب اللہ ایک چیز ہے، بہر حال حضرت کی صحبت سے مجھے فائدہ ہوتا تھا، حضرت کی شفقتوں سے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہ تو ہمارے دوستوں کو اور یہاں کے حاضر باش بزرگوں کو یاد ہوں گی باقی سب سے بڑا فائدہ یہاں کی حاضری میں مجھے یہ ہوتا تھا (جس کی شاید آپ حضرات توقع نہ کریں گے) وہ یہ ہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم یہاں بالکل عامی ہیں اور گنوار ہیں ہمیں ان چیزوں کی ہوا بھی نہیں لگی، اور یہ کہ دین کی حقیقت ان ہی حضرات کے یہاں آ کر معلوم ہوتی، اگر کوئی اور فائدہ نہ ہوتا سوائے اس اصولی اور کلی فائدے کے تو سب سے بڑا فائدہ یہی تھا کہ کہیں تو آدمی کو یہ معلوم ہو کہ وہ کچھ نہیں جانتا، کہیں تو آدمی کو معلوم ہو کہ وہ محتاج ہے، تو سب سے بڑی چوٹ جو یہاں آ کر دماغ پر لگتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم تو بالکل عامی اور جاہل ہیں، ہمیں تو صرف نقوش آتے ہیں باقی دین کی حقیقت سے ہم بہت دور نظر آتے ہیں اسی کو علامہ اقبالؔ نے کسی کے متعلق کہا ہے ؏

سر دیں مار اخبر اورا نظر

او درون خانہ ما بیرون در

یعنی ہمارے لئے دین کی حقیقت سنی سنائی چیز ہے اور ان کے لئے جانچی پرکھی دیکھی بھالی اور چکھی ہوئی چیز ہے وہ گھر کے اندر ہیں اور ہم گھر سے باہر غرض بزرگان دین کے یہاں جا کر آدمی کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے خاص کر پڑھے لکھے لوگوں کی سمجھ میں کہ ہمیں اپنی صورت میں حقیقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے قالب میں روح پیدا کرنے کی حاجت ہے، یہ سب سے بڑا فائدہ ہے۔

فخر ندوہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا حال

مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جب حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع کیا تو ان کے بہت سے غالی معتقدین کو نا گوار ہوا، اور سید صاحبؒ سے احتجاج کیا کہ ہماری جماعت کی ایک طرح کی سبکی ہوئی کہ ہم نے آپ کو بڑا بنایا تھا۔ گویا آپ شیخ الکل تھے اور ہر چیز میں آپ امام کا درجہ رکھتے تھے اور آپ نے دوسرے کا دامن پکڑ لیا، تو اس سے ہماری خفت ہوئی اس پر ایک دن سید صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ عجیب لوگ ہیں ایک طرف تو میرے معتقد بنتے ہیں دوسری طرف مجھ ہی پر اعتماد نہیں کرتے یعنی میں اپنا فائدہ سمجھ کر وہاں گیا تو ان کو اس سے اختلاف ہے گویا میرے استاذ بن کر مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ آپ کہاں چلے گئے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں ان سے پوچھ کر وہاں جاتا، میں تو اپنا فائدہ اس میں دیکھتا ہوں اور آپ کی خاطر وہاں نہ جاؤں، گویا اس دولت سے میں محروم رہوں۔

روح کی ذہانت اہل اللہ ہی کے یہاں ملتی ہے

ان حضرات کے یہاں جو باتیں ملتی ہیں وہ صرف نکتے اور موشگافیاں نہیں ہیں وہ تو ذہانت کا نتیجہ ہے، درحقیقت ذہانت کے چار درجے ہیں اور جو ذہانت کا آخری درجہ ہے وہ روح کی ذہانت ہے، یہ روح کی ذہانت ایسی لطیف ہے کہ بیان الفاظ میں مشکل ہے جہاں سرحدیں ختم ہوتی ہیں دماغ کی ذہانت کی (جس سے پہلے زبان کی ذہانت کا درجہ تھا) وہاں سے قلب کی ذہانت شروع ہوتی ہے اور جہاں قلب کی ذہانت کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے روح کی ذہانت کی سرحد شروع ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ان مخلص اور مقبول بندوں کو حاصل ہوتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ تربیت کا کام لیتے ہیں، اس میں

سامنے ہونا نہ ہونا، مسافت کا قرب وبعد، معرفت وعدم معرفت سب برابر ہے کوئی چیز اس کے لئے شرط نہیں ان حضرات کی روح اتنی براق، اتنی سریع الادراک ہوتی ہے کہ بلا کسی شرط کے خیر وشر کی تمیز ان کو حاصل ہو جاتی ہے، خصوصی طور پر ان حضرات کے یہاں جو چیز مجھے محسوس ہوتی ہے وہ یہی ہے اور یہ بھی اللہ تعالی کا مجھ پر بہت بڑا فضل ہے کہ بغیر کسی وجہ کے جس کی وجہ مجھے خود نہیں معلوم۔ اللہ تعالی نے ایسے بندوں کے پاس مجھے پہونچا دیا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے یہاں ہم نے روح کی ذہانت کے کھلے نمونے دیکھے اور پھر حضرت شاہ (وصی اللہ) صاحبؒ میں، میں نے ان دونوں بزرگوں میں بہت زیادہ مشابہت دیکھی اگرچہ اللہ تعالی نے ان دونوں بزرگوں سے الگ الگ کام لیا، ذوق بھی دونوں کا الگ الگ تھا لیکن بہت سی چیزوں میں مشارکت تھی، خصوصاً قلب کی ذہانت اور روح کی ذہانت میں۔

یہ حالت بہت خطرناک ہے کہ مجھے اب کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں

بہر کیف میں ان حضرات کے یہاں اس لیے آیا کرتا تھا کہ کبھی تو اس پر رعونت اور فریب خوردہ کو یہ محسوس ہو کہ وہ کچھ نہیں ہے کیونکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی چیز خطرناک نہیں ہے کہ اس کو کبھی یہ محسوس نہ ہو کہ کوئی کوچہ ایسا بھی ہے کہ جس سے وہ واقف نہیں اور خاص طور سے دین کے متعلق اگر یہ ذہن میں آجائے کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے اور اب مجھے کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تو اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہے، ایسا آدمی جو بھی دعوی کر دے بعید نہیں ہے اور اسی طرح کے لوگوں نے دعویٰ کیا بھی ہے[1]۔ ان لوگوں نے دعویٰ نہیں کیا جو پہاڑ کے نیچے کھڑے تھے کہ جب سر اٹھاتے تو دیکھتے

---

[1] گمراہ فرقوں کے بانی سب اہل علم ہیں جب کار چلتی ہے تو ڈرائیور کا پاؤں اس کے بریک پر ہوتا ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کہ آسمان بھی بہت اونچا ہے۔ بلکہ جولوگ سمجھے کہ ہم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے ہیں انھوں نے دعویٰ کیا ہے، انسان کے لیےاس سے بڑھ کر کوئی چیز محافظ نہیں اور اس پر یہ بڑا فضل ہے کہ اس کو یہ معلوم ہو کہ دین کی ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں جا کر دین کی وہ باتیں سننے یا دیکھنے میں آسکتی ہیں جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارا میدان نہیں اور یہاں ہمارا گزر نہیں

دین کی حقیقت اللہ کے خاص بندوں کی صحبت سے نصیب ہوتی ہے

کوئی شخص اگر ایسا ہو کہ بولنے پر آئے تو بولتا جائے ،اور لکھنے پر آجائے تو لکھتا جائے اور دنیا بھر کے لوگ مل کر اس کی تعریف کرنے لگیں تو اس سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ ''سرِ دین،، جس کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کو کرنے کی ضرورت ہے اور وہ اللہ کے ان خاص بندوں ہی کے پاس ہوتا ہے، یہی چیز تھی جسکی وجہ سے حضرت ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ نے سید عبدالرزاق بانسویؒ کا دامن پکڑا جو بالکل ہمارے بارہ بنکی اور لکھنؤ کے دیہات کی بولی بولتے تھے جیسے آوت ہے، جاوت ہے۔(یعنی آتا ہے جاتا ہے) یہ ان کی زبان تھی مگر ملا نظام الدین کا حال یہ ہے کہ مناقب رزاقیہ میں دیکھتے چلے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ان کے سامنے بالکل ہیچ سمجھ رہے ہیں اور آپ ہر دور میں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اور اس کے کان (ہنیڈل) اس کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں پھر کار ٹھیک ٹھیک چلتی ہے اور ٹکر نہیں ہوتی اسی طرح جب مرید کی گردن پر شیخ کا پاؤں ہوتا ہے اور اس کے کان اس کے ہاتھ میں ہوتے ہیں تو وہ مرید بھی ٹھیک ٹھیک چلتا ہے اگر کار ڈرائیور نہ ہو تو سیدھے راستہ پر چلے گی مگر جہاں چوراہا آئے گا وہاں ٹکر کھائے گی۔اسی طرح جتنے گمراہ فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کے بانی سب اہل علم ہیں لیکن سب کے سب بدوں شیخ رہبر رہنے والے ہیں پس شروع شروع میں تو ٹھیک چلتے ہیں لیکن جب موڑ یا چوراہا آتا ہے بھٹک جاتے ہیں عجب و کبر میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کی سنتے بھی نہیں ہیں۔
(ملفوظات محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب)

اس کی مثال دیکھیں گے تیرھویں صدی میں مولانا عبدالحی صاحبؒ جن کو شاہ عبدالعزیز صاحب خود شیخ الاسلام کا لقب دیتے ہیں۔اور مولانا اسماعیل شہیدؒ جن کو (شاہ صاحبؒ) حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔چنانچہ فرماتے ہیں کہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی اور حجۃ الاسلام مولانا اسماعیل شہیدؒ اگرچہ یہ دونوں میرے عزیز ہیں اور مجھ سے چھوٹے ہیں۔مگر اظہار حق واجب ہے اس لیے کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو وہ مقام عنایت فرمایا ہے کہ جو کمتر کسی کو حاصل ہے، نیز فرماتے ہیں کہ ان کو مجھ سے کم نہ سمجھو۔تو ان لوگوں کو دیکھئے کہ سید احمد شہیدؒ سے رجوع ہوئے جو کہ امی تو نہیں تھے مگر محض فارسی داں تھے اور جو کوئی پاس سے گذرتا اس سے پوچھتے، ارے بھائی! اس لفظ کے کیا معنی ہیں ذرا بتاتے جایئے۔ان کا یہ علم تھا اور مولانا عبدالحیؒ سے تو انھوں نے پڑھا بھی تھا اس کے باوجود ان دونوں حضرات نے سید صاحب کی رکاب جو تھامی ہے تو مرتے دم تک نہیں چھوڑی، جب کوئی پوچھتا کہ آپ لوگوں نے سید صاحبؒ میں کیا بات دیکھی جس کی وجہ سے ان کی طرف رجوع کیا؟ حالانکہ وہ علم میں بھی آپ کے مقابل میں کوئی مقام نہیں رکھتے، تو فرماتے بھائی ہم کو نماز پڑھنی بھی نہ آتی تھی انھوں نے نماز پڑھنا سکھایا۔روزہ رکھنا نہ آتا تھا انھوں نے روزہ رکھنا سکھایا۔نیز فرمایا کہ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جیسی اور بہت سی چیزیں ہیں یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہو جہاں پڑھے لکھوں کو بھی جا کر معلوم ہو کہ میں کچھ نہیں ہوں اگر خدانخواستہ ایسی جگہیں ختم ہو گئیں اور ایسے اللہ کے بندے نہ رہے اگر صرف مدعیان علم رہ گئے اور ہم جیسے لوگ رہ گئے جن کے متعلق لوگ معلوم نہیں کیا کیا سمجھتے ہیں تو یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔

عالم نشود ویراں تا میکدہ آباد است

اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ کچھ ایسے حضرات موجود ہیں جہاں نہ کسی خوش بیانی کی ضرورت ہے اور نہ کسی بڑے وسیع مطالعہ کی حاجت، یہ سب چیزیں تو ہر جگہ موجود ہیں۔

میرا جی ایسے ہی وعظ میں لگتا ہے

میں تو کہا بھی کرتا ہوں اوراس میں تنہا نہیں ہوں کہ آج کل کے علماء کے وعظ سے میرا جی نہیں لگتا۔ جلسے کی تحقیر اور علماء کی تنقیص نہیں کرتا اوراس کے فائدہ کا بھی انکار نہیں لیکن خدا جانے کیا بات ہے اس کو بیماری ہی سمجھ لیجئے کہ میرا جی نہیں لگتا، ہمارا جی تو بس ایسے وعظ میں لگتا ہے جس میں خالص اللہ اوراس کے رسول کی بات پرانے انداز سے کہی جائے اور جنت اور دوزخ کا تذکرہ کیا جائے۔ چنانچہ جب یہ حضرات تقریر کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہ کتابی علم ہے نہ کتابوں کی باتیں ہیں۔ بلکہ یہ علمی باتیں ہیں سیدھی سادی دین کی باتیں اور ایسے انداز سے کہی جاتی ہیں کہ ہم کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

حضرت مولاناؒ کی خدمت میں بھی ہم جب آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ فرمارہے ہیں وہ حقیقت ہے اوران کے یہاں لب لباب ہے یہ نہیں کہ ایک چیز کو خوب پھیلا کر بیان کیا جارہا ہے۔ یہ چیز تو ہم کو دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ہمارے یہاں کتب خانے ہیں اور دوسرے ذرائع ہیں جن سے ہم کسی بھی مضمون کو پھیلا سکتے ہیں لیکن ان حضرات کے یہاں جو حقائق ہیں ان کی نوعیت ہی کچھ اور ہے۔

اہل اللہ کے یہاں کیا چیز لینے اور حاصل کرنے کی ہے

مولانا جامی صاحب نے ایک عالم کا جو مکالمہ سنایا کہ میں اور جگہوں پر گیا وہاں یہ چیز محسوس نہ ہوئی جو حضرتؒ کی خدمت میں آ کر محسوس ہوئی۔اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ بزرگوں کے یہاں کوئی بنیادی کوئی نیا علم کوئی نئی تحقیق،کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔اس بارے میں بھی لوگ بہت غلط فہمی میں ہیں۔معلوم نہیں کیا سمجھتے ہیں کہ بزرگان دین

کے یہاں جا کر کیسے کیسے دین کے اسرار و نکات اور عجیب عجیب تحقیقات سننے میں آئیں گی، تو یہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ محی الدین ابن عربیؒ کے یہاں مجدد الف ثانی اور شیخ مخدوم یحییٰ بہاریؒ کے یہاں تو ایسے ایسے نکات ہیں کہ بڑے بڑے فلسفی ان کے سننے کے بعد کان پکڑ لیں اور سمجھیں کہ ہمیں تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی، لیکن ان حضرات کے یہاں سے جو چیز لینے کی ہے وہ یہ کہ صورت اور رسم میں حقیقت پیدا کی جائے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی خلاصہ بھی ہے تصوف کا، جس کا مطلب گویا بس اس کے سوا کچھ نہیں کہ نماز تو پڑھتے ہیں صحیح نماز پڑھنے لگیں اور دین کے سارے شعبوں میں حقیقت نہیں تھی، نیت صحیح نہیں تھی، اخلاص صحیح نہیں تھا، رخ صحیح نہیں تھا، حقیقت پیدا ہو جائے اور نیت درست ہو جائے اور اللہ کی رضا کے لیے ہم اس کو کرنے لگیں۔ اور شریعت کے احکام کی تلاش اور ان کا اہتمام پیدا ہو جائے، نیز ان کا ادب و احترام پیدا ہو جائے، احکام شرعیہ کا اہتمام اور انتظام یہ دونوں ہی چیزیں ضروری ہیں بس یہ ہے کہ تل اوٹ پہاڑ جس کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف پتہ نہیں کیا چیز ہے اور تصوف کی حقیقت جو میں بیان کر رہا ہوں اس میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

''تصوف اور نسبت صوفیہ'' کی اہمیت

حضرت مولانا کی تصنیف ''تصوف اور نسبت صوفیہ'' اس سلسلہ کی بہترین چیز ہے، میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا پھر کہہ رہا ہوں کہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی اسکا ترجمہ کیا جائے اور علماء خاص طور پر اس کو پڑھیں کیونکہ تصوف کی اصطلاح نے ہی اس پر پردہ ڈال دیا ہے لہٰذا بجائے تصوف کے جیسا کہ حضرت مولانا کا معمول تھا اس کو ''نسبت احسان'' یا حقیقت سے تعبیر کیا جائے اگر سب حضرات مل کر اس بات کو قبول کرلیں اور گو یہ کام مشکل ہے لیکن اگر ہو جائے تو کیا خوب ہے کہ منکرین تصوف سے ہمارا آدھا اختلاف تو اسی سے ختم ہو جائے گا۔

تصوف کا لب لباب اور خلاصہ

نیز فرمایا کہ تصوف کا لب لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ جو کچھ ہم صبح سے شام تک کرتے رہتے ہیں بغیر کسی نیت کے اور بغیر کسی احتساب کے وہ ہم احتساب اور نیت کے ساتھ کرنے لگیں، ہمارے اندر اصلیت پیدا ہو جائے، نیز اس کی اہمیت پیدا ہو جائے، گویا نمک ہے مگر اس میں نمکینی نہیں ہے۔ شکر ہے مگر اس میں مٹھاس نہیں ہے مٹھاس پیدا ہو جائے پانی ہے مگر اس میں برودت اور تسلی دینے اور پیاس بجھانے کی صلاحیت نہیں، وہ ایسا ہو جائے کہ اس سے ہمارا حلق تر ہو رہا ہو، ہمارے جسم کا ایک ایک عضو تر ہو رہا ہو، اور ہماری زبان سے اللہ کا شکر ادا ہو، ہمارے اور پانی کے درمیان جو رشتہ ہے حقیقت میں وہ ٹوٹ گیا ہے، پانی بھی موجود ہے اور ہم بھی ہیں، لیکن پانی سے جو فائدہ ہم کو پہنچنا چاہئے وہ نہیں پہنچ رہا ہے اس میں پانی کا نقص کم اور ہمارا نقص زیادہ ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارے اور اس کے درمیان پل ٹوٹ گیا ہے پل تعمیر کر لیجئے تا کہ پانی اپنا کام کرنے لگے۔ اللہ کی نعمتیں بٹ رہی ہیں اللہ کی دنیا بالکل اسی طریقے سے ہے جیسی تھی لیکن اس سے استفادہ کے جو وسائل تھے وہ کمزور ہو گئے ہیں، بقول اکبر مرحوم:

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار ونشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

یہی حال دین کی نعمتوں کا ہے، قرآن وہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وہی، احکام شرعیہ سب وہی اور ان پر اللہ کے جو وعدے ہیں سب برحق، لیکن ہمارے اور ان کے درمیان جو رشتہ ہونا چاہئے تھا اعتقاد کا، یقین کا، بھروسے کا اور شوق کا وہ ٹوٹ چکا ہے اسی کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اللہ کی طرف دوڑ واور لپکو

بس یہی چیز ان حضرات سے لینے کی ضرورت ہے اور اسی کے وہ امام تھے ان کی تحریریں اور ان کے ملفوظات اور ارشادات اب بھی موجود ہیں اور ان میں وہی تاثیر ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت نے جو گرامی نامہ میرے نام تحریر فرمایا تھا اس میں خواجہ محمد معصومؒ کی ایک عبارت بھی نقل فرمائی تھی، جس میں ففروا الی اللہ تحریر تھا، میں نے جب حضرت کا وہ خط پڑھا تو مجھ پر کئی دن تک اس کا اثر رہا۔ خواجہ معصوم کا مضمون بالکل ایسا معلوم ہوا کہ ایک زندہ چیز ہے اور ابھی کسی اللہ کے بندے نے لکھا ہے ایک تو حضرت خواجہ محمد معصوم کی تحریر پھر حضرت کا اس کو نقل کرنا ان دونوں باتوں کے امتزاج سے اس میں اثر ہی دوسرا تھا۔

جائے بزرگان بجائے بزرگاں

خدا کا شکر ہے ''جائے بزرگان بجائے بزرگاں'' آج حضرت تو نہیں ہیں مگر حضرت کے جو معمولات تھے اور ان کی اصلاح وتربیت کا جو طریقہ تھا وہ آپ حضرات نے اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے جاری رکھا ہے حضرت کی یہ مقبولیت اور خصوصیت ہے ورنہ بہت سی جگہ دیکھا کہ جب وہ بزرگ اٹھ گئے تو سب چیزیں ختم ہوگئیں اور وہ جگہ خالی ہوگئی، سوا اس کے کہ جا کر زیارت کر لیجئے کوئی پیغام وہاں سے نہیں ملتا اور دل کی دوا وہاں نہیں ملتی بزرگوں نے اسی موقع کے لیے یہ مصرعہ پڑھا ہے ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

چنانچہ جہاں جائیے یہی نظر آتا ہے کہ جن کی دوکان تھی وہ واقعی بڑھا گئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ یہاں کے لوگوں نے حضرت کے کام کو جاری رکھا رسالے کے ذریعہ مجلسوں کے ذریعہ، خطوط کے ذریعہ اور حضرت کے جو جوافادے کے طریقے تھے اس کے

ذریعہ ان چیزوں کو باقی رکھا بیشک دین زندہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ اس کا انتظام رہے گا کہ حقیقی دین باقی رہے۔ اور وہ زندہ انسانوں کے ذریعہ سے زندہ رہے گا۔

سلسلہ چشتیہ صابریہ کے لئے دعائیہ کلمات

لہٰذا اب اس کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تحقیقات اور ملفوظات کے ساتھ ساتھ ان کے سلسلے اور ان کے خاندان اور ان کے دوستوں کو اس کی توفیق دیتا رہے کہ وہ اس کام کو جاری رکھیں اور خود ان سے بھی دوسروں کو وہی پیغام ملتا رہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، اور یہ فیض جاری رہے۔ یہ شہر تو ہمیشہ سے مرکز رہا ہے اور یہاں کیسے کیسے اللہ کے بندے پیدا ہوئے ہیں اور آخر میں حضرت نے بھی اسی جگہ کا انتخاب فرمایا اور وہ چیز زندہ ہوگئی۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است　　　خم وخمخانہ با مہر و نشاں است

الحمد للہ کہ ابھی خم وخمخانہ مہر ونشاں کے ساتھ باقی ہے خدا کا شکر ہے کہ حضرتؒ کے بعد اتنے دن گذر جانے کے باوجود بھی الحمد للہ جگہ خالی نہیں ہے اور یہاں سے وہی پیغام ملتا ہے اور وہی بات کہی جاتی ہے۔

اللہ رکھے آباد آن ساقی ترا میخانہ[1]

---

[1] اصلاح واستفادہ سے کوئی مستغنی نہیں ص ۴ تا ۱۳۔ تعمیر حیات اپریل ۱۹۹۹ء۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو اتنا بلند مقام کیسے نصیب ہوا

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

اگر کسی کے متعلق یہ کہا جا سکتا دعویٰ کے ساتھ کہ یہ کچھ نہیں ہو سکتا تو وہ میں تھا اور خاندان میں طعنے دیئے جاتے تھے میری والدہ مرحومہ جو بیوہ تھیں، میرے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب میں نو سال کا تھا نو دس سال کے درمیان تھا کسی کو کوئی امید نہیں تھی کہ میں کچھ پڑھ لکھ سکوں گا۔

بھائی! دو چیزیں ہوتی ہیں یا ذہانت ہو یا محنت ہو، مجھ میں نہ ذہانت تھی نہ محنت تھی، تو یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کا فضل ہے، دو چیزیں اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائیں، یہ تعریف میری نہیں ان کی تھی جن کے طفیل میں یہ نصیب ہوئیں۔ ایک تو میری والدہ صاحبہ مرحومہ (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن رکھے اور منور فرمائے) ایک تو ان کی دعائیں کہ انہوں نے اپنی عمر وقف کر دی تھی دعاؤں کے لئے بس ان کا یہی اوڑھنا بچھونا تھا اور ایک میرے بزرگوں اور استادوں کی شفقت۔

اگر آپ کے سامنے اپنی علمی کمزوریاں بیان کروں تو شاید آپ یقین نہ کریں اور جو لوگ یقین کریں گے وہ بالکل غیر معتقد ہو جائیں گے میں پڑھا لکھا بہت کم ہوں۔ صاف آپ سے کہتا ہوں میں نے حضرت رائے پوری کو ایک شعر لکھا تھا، میں ہندوستان سے باہر گیا تھا وہاں لوگ محبت سے پیش آئے تو میں نے ان کو لکھا تھا ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اترانا　　　وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

اور الحمد للہ مجھے اس پر اللہ کا فضل ہے اور اس پر یقین ہے کہ جو کچھ ملا وہ میرے

بزرگوں کی دعا اور استادوں کی شفقت اور خدمت سے ملا، اس کے علاوہ خدمت تو میں نے بہت کم کی ہے صلاحیت بھی نہیں تھی اور طاقت بھی نہیں صحت بھی خراب رہی لیکن جو کچھ بھی کی وہ معلوم نہیں کیوں، میری بزرگوں سے جو نسبت ہے اس کی وجہ سے ہر بزرگ نے ہر استاد نے مجھے آنکھوں پر بٹھایا، اور میرے ساتھ محبت کی، اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ چار آدمی میری بات کو سن لیتے ہیں۔

میں نہ مقرر تھا نہ میں کوئی بڑا مدرس تھا نہ کوئی عالم محقق لیکن اس وقت تھوڑا بہت جو ہو گیا، بہت دنوں سے قلم گھسنے کی وجہ اور آنکھیں اپنی بصارت کو کمزور کر دینے کی وجہ سے تھوڑا سا ہو گیا اس کے علاوہ مجھ کو کسی فن میں کوئی امتیاز حاصل نہیں بس محض یہ ہے کہ تھوڑا بہت ان بزرگوں کی شفقت کی نگاہیں پڑنے سے۔

میں طالب علموں سے کہا کرتا ہوں کہ بھائی اصل چیز یہ ہے کہ اپنے استادوں کو راضی کرو اور ان کی دعائیں لو مجھے جو کچھ ملا ہے اسی وجہ سے ملا ہے اور تم کو بھی کبھی جو کچھ ملے گا اسی وجہ سے ملے گا۔[1]

شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ارشاد فرماتے ہیں:

حضرت مولانا (سید ابوالحسن علی ندوی) کو اللہ تعالیٰ نے ایسا علم عطا فرمایا تھا جس میں علم کی روح، خشیت، انابت، تواضع، سادگی، عمل، تقویٰ اور امت کے لئے تڑپنے کی امنگ پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر تھی، آج چار دانگ عالم میں حضرت مولانا کا جو فیض پھیلا ہوا نظر آتا ہے، اس کا ذریعہ تنہا حروف ونقوش کا علم نہیں ہے، بلکہ یہ اثر پذیری اور قبولیت درحقیقت اس سوز دردوں اور گداز قلب کا نتیجہ ہے، جو رات کی تنہائیوں میں اپنے مالک کے سامنے گڑگڑانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو عطا فرمایا تھا۔ اور یہ دولت اللہ والوں کی نیازمندانہ صحبت ومعیت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

---

[1] خطبات مفکر اسلام ص ۱۹۰، ۱۹۱ ج ۳۔

سارے علوم حاصل کرنے کے بعد اصلاحِ نفس وتزکیہ باطن کے لئے وہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور حضرت مولانا الیاس صاحبؒ جیسے بزرگان دین اور اکابر اولیاء اللہ کی خدمات میں طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوئے اور ان سے مسلسل اکتساب فیض کرتے رہے، جس کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم کو ایسا صیقل کیا اور ایسی جلا بخشی کہ اس کی روشنی سے سارا عالم جگمگا اٹھا۔

اس لئے حضرت مولاناؒ کی حیات طیبہ سے ہمیں پہلا سبق یہ ملتا ہے کہ حروف ونقوش پر اترانے اور علم پر گھمنڈ کرنے کے بجائے مجاہدۂ نفس اور اصلاح باطن کے لئے کسی اللہ والے کے پاس جانا چاہئے، جب وہ اللہ والا علم کو صیقل کرتا ہے، اور اسے جلا بخشتا ہے تب اللہ تعالیٰ ایسے علم کی خوشبو سے ساری دنیا کو معطر کر دیتا ہے۔ یہ پہلا سبق ہے جو ہمیں حضرت مولاناؒ کی زندگی سے حاصل ہوا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑے کام کی بات ہے کہ حصول علم کے ساتھ اگر کسی اللہ والے سے تعلق قائم کر کے نفس اور باطن کا تزکیہ نہ کیا جائے تو علم میں برکت نہیں ہوتی[1]

---

[1] نقوش وآثار مفکر اسلام ص ۱۸۴

باب ۸

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی مکاتبت و مراسلت

(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ سے خصوصی مناسبت

مخدوم و معظم، مصدر فیوض وافادات، جامع البرکات دامت فیوضہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید قوی ہے کہ حضرت والا کے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے، اور ماہ مبارک بسہولت وراحت اپنے مشاغل مبارکہ کے ساتھ گذر رہا ہوگا، یہ محبّ دعا گو بھی بحمد للہ بعافیت ہے، اپنی حقیر وناکارہ ذات کے ساتھ جناب والا کی جو شفقتیں، رعایتیں دیکھیں اور اپنے اندر حضرت والا کی ذات گرامی کے ساتھ جو عقیدت ومحبت اور جناب کے علوم وافادات کے ساتھ جو مناسبت محسوس کرتا ہوں اس کی بنا پر یہ عریضہ محض طلب دعا کے لئے پیش کر رہا ہوں، جناب والا سے دردمندانہ ومخلصانہ التجا ہے کہ اس ماہ مبارک اور اس کی ساعت میں اس کی دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے، اور اپنا بنائے اور اپنی ذات عالی کے ساتھ سچا اور مخلصانہ تعلق پیدا فرمادے، اپنی محبت سے دل کو لبریز کردے، اور نفاق سے محفوظ کر کے ایمان حقیقی نصیب فرمادے۔

امید ہے کہ اس دعا کے ذریعہ امت محمدیہ کے ایک حقیر ترین فرد اور ایک ناکارہ

وآوارہ انسان پر مدۃ العمر احسان فرمائیں گے۔ "فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ."

چونکہ مقصود صرف اتنی درخواست تھی اور جواب سے حضرت والا کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا اس لئے جوابی کارڈ یا لفافہ بھیج کر طبیعت پر پابندی کا بار نہیں ڈالا، نفع الله المسلمين بطول بقائكم. ناچیز ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مجبی ومخلصی زاد اللہ حبکم واخلاقکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ ملا، آپ نے خیریت دریافت فرمائی ہے، الحمد للہ آپ کی دعا سے بخیریت ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت ظاہری وباطنی کے ساتھ رکھے، چونکہ آپ نے دعا کی درخواست کی ہے لہذا امتثالاً للامر دعا کرتا ہوں، اپنی طلب صادق عطا فرمائے اور آپ کو مخلصین میں شامل فرمائے، آپ سے بھی اسی دعا کی درخواست ہے۔

والسلام

وصی اللہ عنہ

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب کا حضرت مولاناؒ کے نام سبق آموز مضمون

ایک مضمون درج کرتا ہوں امید ہے کہ حسب حال ہوگا، وھو ھذا۔[1]

[1] اصل مکتوب میں طویل فارسی عبارتیں اور اس کا ترجمہ تھا، فارسی عبارتوں کو حذف کر کے صرف ترجمہ نقل کیا گیا ہے۔

(ترجمہ) حق سبحانہ وتعالی نے تو باوجود اس بزرگی و کبریائی کے جو کہ انہیں حاصل ہے، محض اپنی کامل بندہ نوازی سے اپنی جانب توجہ کرنے کی تمام انسانوں کو حضرات انبیاء علیہم السلام کی زبان پر دعوت دی ہے اور راہِ وصول (طریق) کو بالکل واضح اور زیادہ روشن فرمادیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ انسان اس دعوت سے تو اعراض کرلے اور بالکل آنکھیں بند کرلے اور نفس اور شیطان کی دعوت قبول کر کے حق تعالیٰ کے قرب کی دولت اور وصال کی لذت سے یکسر محروم ہو کر عذاب وحرمان میں مبتلا ہوجائے حالانکہ یہ وہ لذت جس سے محروم ہوا جنت نعیم سے بھی بڑھ کر اور یہ عذاب جس میں مبتلا ہوا عذاب جحیم سے بھی بدتر ہے، لوگو! خدا کی طرف دوڑو دیکھو میں تم کو ڈرانے والا ہوں۔

(ترجمہ) ان بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت میں نہ اپنے کو دیکھا اور نہ غیر کو بلکہ سب سے یک لخت خالی ہوگئے اور عشق مولی میں اپنے نفس کو بلکہ سارے ہی جہاں کو چھوڑ دیا، اور ماسوائے اللہ کو اللہ کے راستے میں خیر باد کہہ کر خود کو ان کے ساتھ واصل کرلیا، اس طرح سے کہ اب اگر کسی سے تعلق رکھتے ہیں تو اسی سے تعلق رکھتے ہیں، اور کسی سے واصل ہیں تو اس سے واصل ہیں۔

چنانچہ ان حضرات کے باطن کو ماسویٰ اللہ سے ایسا انقطاع کلی ہوجاتا ہے کہ اب اگر ماسویٰ کو سالہا سال یاد کریں تب بھی یاد نہ آئے، اسی طرح سے نفس کی انانیت اور رعونت سے ایسا نکل جاتے ہیں کہ اب اس کے بعد لفظ ''لنا'' کا استعمال بھی ان کو شرک معلوم ہوتا ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالی سے جو عہد باندھا تھا اس کو سچ کر دکھایا اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تجارت اور بیع اللہ کے ذکر سے مشغول نہیں کرتی، خداوندا تو مجھے بھی اسی قوم میں سے کردے یا کم از کم ان کی زیارت کرنے والوں ہی میں سے بنادے کیوں کہ ان دو کے علاوہ تیسری قوم میں ہونے کی طاقت نہیں رکھتا، اب جو شخص کہ طریق میں داخل ہونے کی ہوس رکھے اور طلب خدا کے خیال کا بیج اپنے دل میں بونا چاہے تو اس

کو لازم ہے کہ تمام چیزوں کو ترک کر کے مشائخ طریق کی صحبت اختیار کرے اور لوازم طلب کے آگے اپنی جان نثار کر دے، اور جس جگہ سے بھی اس دولت کی خوشبو اس کے مشام جان میں پہونچے اس کی تحصیل کے درپے ہو جائے، کسی نے خوب کہا ہے کہ اب اس کے بعد مصلحت کار اس میں سمجھتا ہوں کہ مے خانہ کے دروازہ پر جا پڑوں اور خوشی خوشی وہیں ایام گذار دوں،

(ترجمہ) کسی اللہ والے کا کہنا کہ اگر کوئی طالب خدا ساری عمر اللہ تعالی کی جانب متوجہ رہے لیکن اس کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی اگر اس نے اس سے اعراض برتا تو اس سے فوت شدہ امور کی تعداد حاصل شدہ سے بڑھ جائے گی، یعنی اس کی وجہ سے اس کو نقصان جو پہونچے گا وہ اس کے نفع سے کہیں زیادہ ہوگا۔ (مکتوب دوصد و پنجاہ و پنجم)

والسلام وصی اللہ عفی عنہ

رمضان المبارک ۷۴ھ

عقیدت و محبت اور درخواست دعاء کا خط

بخدمت سراپا خیر و برکت، رحمت و شفقت حضرت مولانا دامت فیوضہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ حضرت والا کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، عرصہ سے کوئی عریضہ ارسال خدمت کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، اور خود اپنا ہی نقصان کیا کہ اگر عریضہ لکھتا تو حضرت والا کا قلب مبارک متوجہ ہوتا اور اس ناکارہ وآوارہ کی یاد تازہ ہوتی، سفر سے پہلے بھی عریضہ لکھنے اور دعا کی درخواست کرنے کا ارادہ تھا مگر توفیق نہ ہوئی، اب پھر قلب پر تقاضا ہوا اور الحمدللہ اس کی تکمیل کی توفیق ملی۔

اگرچہ حضرت والا سے بہت دور دور رہا اور بہت دیر دیر میں نیاز حاصل ہوتا ہے،
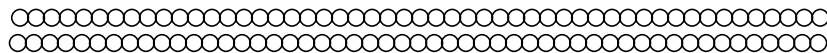
مگر حضرت کی محبت سے اپنے قلب کو معمور اور اس محبت کی وجہ سے قلب کو مسرور پاتا ہوں اور طبعی کشش محسوس کرتا ہوں، تین مہینے سے زائد باہر رہنے کے بعد حاضر ہوا ہوں، شاید کچھ عرصہ کے بعد حاضری کی سعادت حاصل ہو، ابھی پھر ایک سفر درپیش ہے، اور مشاغل وذمہ داریوں کا اقتضاء یہاں کچھ عرصہ قیام کا ہے۔

اس عریضہ کا مدعا قلب مبارک کو متوجہ کرنے اور اپنے حق میں دعائیہ کلمات کہلوانے کے سوا کچھ نہیں ہے، امید ہے کہ اس مقصد میں یہ عریضہ کامیاب ہو۔

والسلام مع الاکرام

ناچیز وناکارہ ابوالحسن علی

۱۵/ربیع الاول ۱۳۷۶ھ

۲۱/اکتوبر ۱۹۵۶ء

اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت مجلس میں سنائے جانے کی درخواست

مخدومنا وبرکتنا حضرت مولانا دامت برکاتہ وفیوضہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالی کی ذات کریم سے امید قوی ہے کہ حضرت والا کا مزاج گرامی اب اور بہتر ہوگا، اور درمیان میں جو اثر پڑ گیا تھا وہ زائل ہو گیا ہوگا، اللہ تعالی آں مخدوم کی ذات والا صفات کو تا دیر سلامت با کرامت رکھے، اور طالبین اور عامۃ المسلمین کو منتفع ہونے کی بیش از بیش توفیق اور اس وجود گرامی کی قدر و معرفت عطا فرمائے۔ اللھم آمین.

اس سفر میں حضرت والا نے جس شفقت وذرہ نوازی کا برتاؤ فرمایا اس کا مزہ آج تک دل میں ہے اور

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

کہاں یہ عامی، کہاں شیخ وقت کے الطاف!

عصر ومغرب کے درمیان کی مجلس میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا تھا کہ بیماری میں ہر چیز سے یہاں تک کہ گفتگو کرنے سے بھی طبیعت برداشتہ ہوجاتی ہے، ایسی حالت میں جی چاہتا ہے کہ کوئی اور گفتگو کرے اور ہم سنیں، چونکہ مرض کی ایک کیفیت ہے اس لئے دعا تو یہی ہے کہ یہ کیفیت زائل ہوچکی ہو، اور حضرت والا کی طبیعت گفتگو اور نطق کی طرف متوجہ ہو، اور خدام ومخلصین ارشادات عالیہ اور تحقیقات طیبہ سے مستفید ہورہے ہوں، لیکن اگر اس کا کچھ بھی اثر ہو تو اس کا ایک بدل تجویز کیا ہے کہ اپنی ایک حقیر کتاب (تاریخ دعوت وعزیمت) پیش خدمت کروں اور وہ کبھی کبھی حضرت کی مجلس میں پڑھ کر سنادی جائے، اس کی جرأت اس لئے بھی ہوئی کہ اس کتاب کے بعض مضامین سے (جو اکابر کے کلام وتالیفات سے ماخوذ ہیں) حضرت کے اذواق وارشادات کی تائید ہوتی ہے، نہ اس کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب ضرور ہی سنائی جائے اور نہ اس کا انتظار رہے گا، نہ حضرت والا سے کسی تبصرہ یا اظہار رائے کا مطالبہ، صرف یہ کتاب وہاں موجود رہے اور اگر وہ کچھ بھی تفریح طبع کا ذریعہ ہوسکے تو اپنی سعادت سمجھوں گا۔

والسلام

ناچیز ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مکرمی جناب مولانا دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ اب طبیعت بہت اچھی ہے، اس وقت کے اعتبار سے اب قوت بھی

الحمدللہ ہوگئی ہے، اور روز افزوں ہے، دعا فرمائیے کہ اللہ تعالی پوری طرح قوت عطا فرمائے تا کہ کچھ کام کرسکوں، آپ نے چند کلمات میں جس محبت کا اظہار فرمایا ہے اس پر دل سے آپ کا ممنون ہوں، اللہ تعالی دین و دنیا میں آپ کے مراتب بلند فرمائے، اور بیش از بیش اپنے تعلق اور اپنی رضا کی تحصیل کی توفیق عطا فرمائے، باقی آپ نے جو لکھا ہے کہ ۔

کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

تو اس کا صحیح مصداق تو یہ تھا کہ میں اسے پڑھتا، کیوں کہ ایک بادشاہ نے کسی دہقاں کے یہاں نزول فرمایا تھا اس پر اس نے یہ کہا تھا، تو آپ کی مثال شاہوں کی سی ہے کہ کبھی یہاں اور کبھی وہاں نزول فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک دہقاں کے یہاں بھی نزول فرما کر اس کو شرف بخشا، اس لئے اگر میں کہوں تو حق بجانب ہوں کہ

”کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید“

بلکہ پورے ہی قطعہ کو دہراتا ہوں کہ ۔

زقدر شوکت سلطاں نگشت چیزے کم — التفات بمہماں سرائے دہقانے
کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید — کہ سایہ برسرش انداخت چوں تو سلطانے

اور آپ نے اپنی بعض تصانیف کے متعلق جو یہ تحریر فرمایا ہے کہ مرض کی وجہ سے گفتگو کرنے کو جی نہیں چاہتا تو مجلس میں اس کو پڑھ کر سنایا جائے تا کہ تفریح طبع کا ذریعہ ہو سکے، اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ اس کے مضامین ارشادی ہیں جیسا کہ آپ نے بیان فرمایا تو میں ارشادی مضامین کو تفریح کا سبب نہیں بناؤں گا، کیوں کہ یہ اس کی ناقدری ہوگی بلکہ میں یہ کروں گا کہ اس کا از خود مطالعہ کروں گا، اور جس طرح سے بزرگوں کے اقوال سے اثنائے گفتگو میں استدلال کرتا ہوں اسی طرح سے اس کے مضامین کو بھی لوگوں کے سامنے پیش کروں گا۔

لیکن یہ سب کچھ ابھی نہیں بلکہ معتد بہ قوت کے بعد کروں گا کیونکہ ابھی تو یہ حال ہے کہ صرف فرائض اور سنن پر اکتفا کرتا ہوں، نوافل کی ادائیگی میں بھی تعب محسوس کرتا ہوں، مغرب کے بعد بھی صرف دو رکعت پڑھ کر لیٹ رہتا ہوں اور یوں کسی کی گفتگو سننا جس میں وقفات بھی ہوتے رہتے ہیں، اس میں تو تعب نہیں ہوتا ہے بلکہ کچھ نشاط ہی ہوتا ہے اور کسی کتاب یا مضمون کو مسلسل سننا اس کا تعب خود پڑھنے یا خود کلام کرنے سے کم نہیں ہے، اس لئے فی الحال شاید مستفید نہ ہوسکوں، باقی بعد صحت تو انشاء اللہ تعالیٰ اس سے پورا کام لوں گا جس کے لئے آپ حضرات کی دعاؤں کا محتاج ہوں۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

۲۴/ ربیع الاول ۶۷ھ حال مقیم گورکھپور

حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس سے حضرت مولاناؒ کا تاثر

مخدومی و معظمی دامت برکاتہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت کی شفقت وعنایت جو اس بندۂ حقیر و گنہگار پر ہے اس سے دل بہت ہی متاثر ہے یہ عاجز اس کو اللہ رب العزت کی خاص نعمت خیال کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس تعلق خاطر کی وجہ سے ایمان پر خاتمہ ہو، اور وہاں کے عذاب سے نجات مل جائے، صبح کی مجلس میں حاضری کی سعادت ہوئی تھی، ارشادات عالیہ سے بہت ہی نفع ہوا، اور اپنی شامت اعمال کا احساس رہا، اپنے لئے اور ہمشیرہ کے لئے دعا کی استدعا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت کا سایہ تادیر قائم رکھے۔

ابوالحسن علی ندوی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی عنایت ومحبت سے بندہ تو خود متاثر ہے، آپ ہی کے اثر کا یہ اثر ہے، یہ تعلق خاطر الحمدللہ بڑی نعمت ہے، اللہ تعالی باقی رکھے، اور اس پر خاتمہ فرمائے اور عذاب سے نجات مل جائے، مجلس کی باتوں سے نفع اور احساس کی زیادتی یہ مناسبت دینیہ کی بین دلیل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو روز بروز بڑھائے اور اپنے صالح بندوں میں داخل فرمائے۔

ہمشیرہ صاحبہ کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں اور آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

اصلاح نفس وترقی باطن اور تذکیر بالقرآن کی اہمیت

۲۵ر شوال المکرّم ۷۷ ۱۳ھ

۱۶ر مئی ۱۹۵۸ء

مخدومی ومعظمی دامت برکاتہ والطافہ ومکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آداب خادمانہ کے بعد گذارش ہے کہ یہ ناچیز وناکارہ حضرت والا سے رخصت ہوکر بعافیت اپنے مستقر پر پہنچا، حضرت والا کی شفقتیں اور ذرہ نوازی برابر یاد آتی رہی، حضرت والا نے جس اہم ومبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی، ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظر انداز کر دیا ہے، جناب والا کے ارشاد سے اس کی اہمیت وعظمت تازہ ہوئی، اور اس موضوع پر اپنی بے بضاعتی

کا احساس ہوا، اب جی چاہتا ہے کہ خاص طور پر اس کا مطالعہ کرے، اور اگر خدا توفیق دے تو حافظ ابن قیم کی کتاب ''حاوی الارواح'' کے طرز پر اردو میں اس کا ذوق بڑھانے اور عام کرنے کے لئے بھی ایک کتاب لکھے، جو مستند احادیث ومنتخب آثار واخبار پر مشتمل ہو۔

سفر الہ آباد اپنی صعوبت وموسم کی سختی کے باوجود اس لئے قیمتی تھا کہ حضرت والا کی زیارت ہوگئی اور کچھ دیر صحبت بابرکت میں بیٹھنے کا موقعہ ملا اور ارشادات سے مستفید ہوا، امید ہے کہ حضرت کا مزاج بالکل بعافیت ہوگا۔ والسلام مع الاکرام

ابوالحسن علی ندوی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

حبی ومحبی سلمہ اللہ تعالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرمت نامہ نے شرف صدور بخشا، باعث ازدیاد محبت وخلوص ہوا، جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے، ارقام فرمایا ہے کہ جس اہم ومبارک موضوع کی طرف توجہ دلائی ہے وہ میری اصلاح وتعلیم کے لئے بہت مفید تھی، ہم لوگوں نے اس موضوع ومضمون کو بالکل فراموش ونظر انداز کر دیا ہے، اس کو سن کر بے ساختہ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے ؎

لگ چلا تھا دل قفس میں پھر پریشاں کر دیا
ہم صفیر و تم نے پھر ذکر گلستاں کر دیا

اب میں جناب سے اجازت چاہتا ہوں کچھ عرض کرنے کی، بعد آنے اجازت نامہ کے، قدرے تفصیل سے عرض کروں گا۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مکتوب

۹ر ذی قعدہ ۱۳۷۷ھ

۲۹ر مئی ۱۹۵۸ء

مخدومی و مشفقی دامت برکاتہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ حضرت والا کا مزاج گرامی بخیر ہوگا، مجی خاں صاحب جناب والا کا شفقت نامہ اور ارشادات عالیہ کی نقل لائے، میں سفر میں تھا، وہاں سے بہت خستہ وشکستہ آیا، گرمی کا طبیعت وصحت پر اثر پڑا تھا، اس لئے جلد مکتوب گرامی کی نقل روانہ نہ کرسکا اب بعد استفادہ کے روانہ کررہا ہوں، اصل مکتوب تبرکاً رکھ لیا ہے۔

جناب نے از راہ شفقت ومکرمت تفصیل سے ارشاد فرمانے کا جو وعدہ گرامی فرمایا ہے اس کے تحقق کا انتظار ہے، امید ہے کہ جلد مستفید فرمائیں گے، اور اس ناچیز کی اصلاح وتربیت سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

جناب والا کے اس ارشاد گرامی کو بار بار بڑے فخر وسرور سے پڑھا کہ ’’جو حضرات میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں ان میں غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے۔‘‘ یہ جملہ میرے لئے بشارت عظیم اور سرمایۂ تسکین ہے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، امید ہے حضرت والا کا مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

ناچیز طالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مکرمی زاد اللہ عرفانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، الہ آباد میں امسال گرمی شدید ہوئی، بہت سخت تکلیف ناقابل برداشت ہوئی، ادھر تو گرمی کی تکلیف ادھر ایک مکان لینے اور پھر اس میں منتقلی کے انتظامات درپیش رہے، اس لئے مضمون کے ارسال میں تاخیر ہوئی، آپ کو انتظار میں تکلیف ہوئی ہوگی، امید ہے کہ معاف فرمائیں گے، ایک سب سے بڑی وجہ حیا تھی، اہل علم سے تخاطب میں اپنی کم مائیگی اور ان کے مرتبہ کے پیش نظر ہونے سے سخت حیا و خجلت دامن گیر ہو جاتی ہے، مگر آج ہمت کر کے پیش کر رہا ہوں امید ہے کہ اس جرأت و جسارت کو اپنے اخلاق کریمانہ سے نظر انداز فرما کر معاف فرمائیں گے۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

نوٹ:۔اس خط کے ہمراہ ایک طویل مضمون تھا جو ”تذکیر بالقرآن“ کے نام سے طبع ہوا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا مکتوب

۱۶ر محرم ۱۳۷۸ھ

۴ر اگست ۱۹۵۸ء

مشفق محترم مخدوم و معظم دامت برکاتہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج مبارک بعافیت ہوگا، گرامی نامہ رجسٹری شدہ موجب منت و باعث استفادہ ہوا، اللہ تعالیٰ ان توجہات عالیہ اور حیات غالیہ کو بلند سے بلند تر فرمائے،

لیکن یہ گرامی نامہ اچانک بخاری شریف کے اس جملہ پر ختم ہوجاتا ہے، "**فاعلم أنه لا إلـه إلا الله فبدأ**" اب یا تو اس کے بعد کے اوراق لفافہ میں رکھنے سے رہ گئے یا دوسری قسط میں موصول ہوں گے، درخواست ہے کہ اس گرامی نامہ کو مکمل فرمادیا جائے کہ نہایت مفید اور مؤثر ہے، نیز اگر رائے عالی کے خلاف نہ ہو تو "الفرقان" میں اس کو اشاعت کے لئے دے دیا جائے کہ باعث افادۂ عام اور تنبیہ علمائے کرام وواعظین عظام ہو۔

امید ہے کہ مزاج مبارک بعافیت ہوگا۔ طالب دعا

ابوالحسن علی

حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

محبی سلمکم اللہ تعالی وزادکم عرفاناً

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، ابھی ابھی آپ کا خط ملا، یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ الحمد للہ آپ کو یہ مضمون پسند ہوا، آپ نے جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہاں سے آخر تک نقل کرا کے دوبارہ روانہ ہے، اس کو شامل مضمون کر لیجئے، نقل دوسرے پرچے پر ہے اور ایک تیسرے پرچہ پر کچھ زائد مضمون اور ہے جو اس دفعہ کا اضافہ ہے، اس کو بھی اسی کے ساتھ ملا لیجئے۔

اور آپ نے اس کی اشاعت کے متعلق فرمایا ہے تو اگر مفید تصور فرمائیں تو ضرور طبع فرمائیں، اللہ تعالی اس کے نفع کو عام وتام فرمائے۔

جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب نیز مولانا محمد منظور صاحب کی خدمت میں سلام مسنون فرمادیں۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مکتوب

۸؍اگست ۱۹۵۸ء ۲۰؍محرم ۱۳۷۸ھ

مخدومی و معظمی دامت برکاتہم

گرامی نامہ نے سرفراز کیا اور مضمون[1] کی تکمیل ہوگئی، حقیقتاً مضمون باوجود عبارت آرائی اور تکلفات سے دور ہونے کے نہایت مؤثر اور مفید ہے، الحمدللہ جناب والا نے اس کی اشاعت کی درخواست کو منظور فرمالیا، وہ انشاء اللہ ''الفرقان'' کے آئندہ نمبر میں شائع ہوجائے گا۔

اس سے پہلے محترمی شاکر حسین خاں صاحب نے حضرت کے دو رسالے ''اخوت'' اور ''مضمون ذکر'' بھیجے تھے وہ بھی نہایت مفید ہیں، خصوصیت کے ساتھ ذکر والا رسالہ تو بہت ہی بصیرت افروز ہے، اللہ تعالیٰ فیوض عالیہ اور افاضات قدسیہ کو قائم ودائم رکھے، سفر کی وجہ سے رسید میں تاخیر ہوئی۔

والسلام مع الاکرام

ابوالحسن علی

اہل علم واہل مدارس کے لئے رسالہ وصیۃ الاخلاص لکھنے کی درخواست

مشفق محترم مخدوم و معظم دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ حضرت والا کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے، جناب والا سے رخصت

[1] یہ مضمون رسالہ کی شکل میں علحدہ تذکیر بالقرآن کے نام سے شائع ہوا ہے، مجموعہ تالیفات مصلح الامۃ میں بھی شامل ہے۔

ہوکر اور جلسہ سے فراغت کر کے بخیر و براحت اپنے وطن رائے بریلی آیا، راستہ بھر جناب کی شفقتوں اور ارشادات عالیہ کا مزہ لیتا رہا اور التفات خاص سے اپنے شکستہ دل کو تسلی دیتا رہا، متعنا اللہ بفیوضکم، چند رسائل گرامی ساتھ لایا تھا ان کے مطالعہ کا موقع ملا، جی چاہا کہ جناب والا کی خدمت میں عرض کروں کہ "وصیۃ الاخلاص" کے نام سے بھی ایک رسالہ تحریر فرمایا جائے، خاص طور پر یہ خیال اس کا داعی اور محرک ہے کہ مدارس عربیہ میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کی بڑی تعداد اخلاص فی التعلیم و اخلاص فی التعلم سے نہ صرف بے بہرہ بلکہ بے حس ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اس کے روحانی و اخلاقی ثمرات مرتب نہیں ہو رہے ہیں، اور اندیشہ ہے کہ آخرت میں سخت مایوسی اور شرمندگی ہوگی، اگر تعلیم و تعلم کے فضائل احادیث صحیحہ سے اور اس کے متعلق اپنی تشریحات و تطبیقات قلم بند فرمادی جائیں تو ہم اہل مدارس کے لئے بہت نافع ہوں گی۔

شوال کا مہینہ مدارس دینیہ عربیہ کے افتتاح کا ہوتا ہے، اس وقت اس رسالہ کی اشاعت نہایت مفید ہوگی، اگر یہ معروضات ناپسند نہ فرمائی جائیں تو ضرور اس اہم موضوع کی طرف توجہ فرمائی جائے اور "التذکیر بالقرآن" کی صورت میں ہو یا مستقل رسالہ ہو، انشاء اللہ مفید اور نہایت باعث برکت ہوگا۔ واللہ الموفق و المستعان.

والسلام

طالب دعا و توجہ

ابوالحسن علی

مجموعہ تالیفات مصلح الامۃ ص ۱۷۹ ج ۳

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

حبی ومحبی سلمکم اللہ تعالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ موجب مسرت ہوا، آپ کے تاثرات اور موجب مسرت ہوئے، جس امر کا آپ نے مشورہ دیا ہے، ہے تو میری حیثیت سے باہر، مگر آپ کی توجہ اور خلوص سے شاید کچھ کام ہوسکے، اور اس موضوع پر قلم اٹھاسکوں، خاص کر اہل علم حضرات سے تخاطب اور پھر اخلاص کی بحث اور ان سے اخلاص کا مطالبہ اور ان کو اس کی ترغیب وتشویق اور اس کے خلاف سے ترہیب وتنفیر بڑا مشکل کام اور پر خطر امر ہے، مگر اللہ تعالیٰ جس پر آسان کرے اس پر آسان ہے۔ ؎

بے عنایات حق وخاصان حق

گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

بہر حال جس موضوع پر کچھ لکھنے کے لئے خواہش ظاہر فرمائی گئی ہے، وہ تو میرا موضوع بحث ہی ہے اور اب آپ نے بھی توجہ فرمائی ہے تو ارادہ میں مزید تقویت ہوگئی، اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی تو ضرور کچھ لکھوں گا، مگر اس کے ساتھ ساتھ آپ سے بھی یہ درخواست ہے کہ اس معاملہ میں دعا سے میری مدد فرمائیں۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

مجموعہ تالیفات مصلح الامۃ ۱۸۰ ج ۳

خیریت اور تعزیت کا خط

۵؍شوال ۱۳۷۹ھ

۳؍اپریل ۱۹۶۰ء

مخدومنا المعظم دامت برکاتہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، گرامی نامہ سے نیز شاکر حسین خاں صاحب کے عنایت نامہ سے ایک حادثہ کی اطلاع ملی تھی چندروز بعد ''سیاست جدید'' کان پور سے دوسرے حادثہ کی اطلاع ملی، اور معلوم ہوا کہ دونوں صاحبزادیوں نے داغ مفارقت دیا، کئی روز تک تو شبہ رہا کہ اخباری اطلاع ہے، تصدیق طلب ہے مگر اہل تعلق سے اس کی تصدیق ہوئی تو بڑا قلق ہوا إنا لله وإنا إليه راجعون.

جی چاہا کہ ایک روز کے لئے حاضر ہوجاؤں اور فریضہ تعزیت ادا کروں، مگر ادھر چندروز سے زبان میں ایک زخم کی وجہ سے تکلیف رہی، یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت والا خاص الہ آباد میں نہیں بمرولی میں مقیم ہیں اور آنے جانے میں زحمت ہے، خدا کرے کسی بہتر موقع سے حاضری کا شرف حاصل ہو، اللہ تبارک وتعالی دونوں کی مغفرت فرمائے۔

جناب والا کے لئے یہ مجاہدات اضطراری باعث رفع درجات اور اجور جزیلہ ہوئے، اللہ تعالی اب ان احزان واکدار سے محفوظ رکھے اور سب متعلقین کو سلامت وباکرامت رکھے۔

طالب دعا

ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واقعات جو آپ نے سنے صحیح ہیں، آپ اس وقت تشریف لائے ہوتے تو میرے تقویت قلب کے لئے ایک امر پیدا ہو جاتا، جی ہاں بمرولی میں قیام ہے اورالہ آباد سے دور ہے، مغفرت کے لئے دعا فرماتے رہئے، مجاہدہ اضطراریہ میں شک نہیں، خدا کرے صبر حاصل ہو جو اختیاری مجاہدہ ہے، دعا فرماتے رہئے کہ اللہ تعالیٰ احزان واکدار سے محفوظ رکھے اور سب متعلقین کو سلامت رکھے۔ آمین۔ والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

صرف درخواست دعاء کا خط

سراپا شفقت والطاف دامت برکاتہ وزیدت الطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، جناب کے بیش قیمت اور بابرکت اوقات میں خلل ڈالنا مقصود نہیں، یہ عریضہ صرف اس مقصد سے ارسال کیا جارہا ہے کہ رمضان المبارک کے اس اخیر عشرہ میں جناب والا سے دعاء کی درخواست کی جائے، خاص طور سے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔ ع

برکریماں کارہا دشوار نیست

باوجود اپنی مکمل نااہلی اور بے بضاعتی کے عرصہ سے اپنے بزرگوں میں جناب والا کے لئے دعا کرنے کا معمول ہے اور اس کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔ والسلام

ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مولانا المحترم دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمدللہ بخیریت ہوں۔ والا نامہ نے عزت بخشی، جناب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ میں نے تمہارے لئے دعا کا معمول بنالیا ہے، اس سے زیادہ میرے لئے مسرت کا کیا باعث ہوسکتا ہے، آپ کی خیر خواہی اور محبت کا پورا اور بین ثبوت ہے، اس سے زیادہ لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

بغرض علاج لکھنؤ تشریف آوری اور ندوۃ العلماء میں قیام کی درخواست

مخدومنا المعظم مشفقنا المحترم دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ جناب والا کا مزاج بعافیت ہوگا، علالت طبع نے ہم خدام ومحبین کو برابر تشویش میں رکھا لیکن احباب کرام کے ذریعہ جو الہ آباد حاضر ہوئے یا جو ٹیلیفون پر خیریت دریافت کرتے رہتے ہیں یہ معلوم کرکے اطمینان ہوتا رہا کہ مزاج روبصحت ہے، پھر بھی دل لگا ہوا ہے اور خیریت وحالات کا برابر انتظار رہتا ہے، اس زمانہ علالت کے دوران بھی جناب والا کی توجہات کا علم ہوتا رہا اور مختلف احباب کے ذریعہ نوازش فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ ان شفقتوں کی جزاء عطا فرمائے۔

آج صبح یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ بعض مخلصین کی خواہش اور تجویز

ہے کہ جناب والا بغرض علاج و راحت لکھنؤ تشریف لے آئیں، مجھ ناچیز کو بھی اس رائے سے بالکل اتفاق ہے، یہاں علاج کی سہولتیں یقیناً الہ آباد سے زیادہ ہیں، شفاء الملک حکیم شمس الدین احمد صاحب بھی مشورہ میں شریک ہو سکتے ہیں، جن کو پچھلے علاج کا تجربہ ہے، اگر جناب والا اس درخواست کو از راہ کرم و شفقت منظور فرمالیں تو پھر میری مخلصانہ اور بہ اصرار گذارش ہے کہ قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں ہو جس کو متعدد خصوصیتیں حاصل ہیں، وہاں جناب کے متعدد خدام اور محبین موجود ہیں، سکون اور یکسوئی بھی ہے، ہم جنس لوگ ہیں، شہر سے الگ ہے اور کچھ زیادہ فاصلہ بھی نہیں، مجھے بھی اپنی معذوری کی بنا پر حاضری اور خدمت کا موقع زیادہ ملے گا، مسجد بالکل متصل ہے، امید ہے کہ اس درخواست کو شرف پذیرائی بخشا جائے گا، اور ہم خدام کو سرفراز فرمایا جائے گا۔

والسلام

ناچیز ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

مولانا المحترم دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

رفع انتظار کے لئے آپ کے خط کا جواب تار سے دیدیا، موصول ہوا ہوگا، اس سلسلے میں مزید کہنا چاہتا ہوں کہ اب ان حالات میں میرے لئے کہیں کا سفر بہت مشکل ہو گیا ہے، علاج کے لئے اگر کہیں جاتا ہوں تو یہاں لڑکیاں پریشان ہو جاتی ہیں، شب و روز رونے ہی میں گذرے گا، اور اگر سب کو لے کر آؤں تو یہ اس سے زیادہ مشکل ہے، پھر یہ کہ گذشتہ بار علاج کے لئے آپ کے یہاں آچکا ہوں، عوام کے ہجوم و اژدہام کی وجہ سے طبیعت پریشان ہو گئی اور یہ کچھ آپ ہی کے یہاں کا نہیں سب جگہ کا حال یہی ہو گیا ہے،

کسی سے عقیدت اور محبت کے معنی ہی ان کے نزدیک بدن پر گرنے کے ہیں، اب اگر لوگوں سے نہ ملوں تو بداخلاقی سمجھی جائے اور ہر وقت ملوں تو قویٰ اس کے متحمل نہیں، کوئی نظم مقرر کروں تو لوگوں کو ناگوار گذرے، غرض عوام الناس کا معاملہ اختیار سے باہر ہے، اس لئے اسلم صورت یہی ہے کہ انسان جہاں ہے وہیں پڑا رہے۔

انہیں حالات کی بناء پر کہیں آنے جانے کی اور ہمت نہیں پڑتی، یوں اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کچھ ایسا ہوا کہ اس مرتبہ بھی یہاں بہت سے مخلصین اطباء جمع ہوگئے، حکیم مسعود احمد صاحب اجمیری بمبئی سے تشریف لائے، حکیم افہام اللہ صاحب علی گڑھ سے اور حکیم محمد عمر صاحب دیوبند سے تشریف لائے اور آپ کے حکیم منظور احمد صاحب جون پور سے آئے اور کئی بار آئے، ہوشیار آدمی ہیں ان کی گفتگو اور تجویز سے اطمینان بھی ہوا، سب حضرات نے نہایت مستعدی اور توجہ سے علاج کیا جس سے بحمد للہ نفع ہوا، اب کئی دنوں سے خون بھی بند ہے، نیز نیند وغیرہ بھی آرہی ہے، اب سب حضرات نے بالاتفاق یہ بھی کہا ہے کہ اب کسی خاص علاج کی ضرورت نہیں، غذا ہی سے انشاء اللہ تعالیٰ قوت آجائے گی اور کسر پوری ہوجائے گی، آپ حضرات کو اس درمیان میں مختلف خبریں جو ملتی رہیں تو اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رعاف کے دورے ہوتے تھے، جس دن خون آجاتا تھا لوگ دیکھ کر گھبراتے تھے اور کہتے تھے کہ طبیعت زیادہ خراب ہے اور جب بند رہتا تو بجز کسی قدر ضعف کے اور کوئی بات قابل تشویش نہ تھی، اسی لئے میں نے عرض کیا ہے کہ اب علاج کے لئے شاید آنے کی ضرورت نہ پڑے، البتہ آپ کی عیادت بھی ایک مستقل مقصد ہوسکتا ہے، اس لئے قوت آنے پر طبیبوں کے سفر کی اجازت پر جی چاہتا ہے کہ آپ سے ملاقات کروں۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ مارچ ۱۹۶۶ء

اطلاع حال اور خیریت کا خط

رائے بریلی

۲۰ر محرم ۱۳۸۶ھ

۱۳ر مئی ۱۹۶۶ء

مخدومنا المعظم مشفقنا المحترم دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شفقت نامہ باعث سرفرازی ہوا، جواب میں کسی لکھنے والے کے نہ ملنے کی وجہ سے تاخیر ہوئی، آج کل اپنے وطن رائے بریلی آیا ہوا ہوں، الحمد للہ یہاں کے قیام سے صحت کو بہت فائدہ اور ترقی ہے۔

خدا کرے بمبئی کا قیام صحت کی روز افزوں بحالی اور ترقی کا باعث ہو اور گرمی کا یہ موسم بعافیت ختم ہوکر اپنے مرکز ارشاد وتربیت مع الخیر واپسی ہو، میرے لئے یہ بات بڑی تقویت وطمانینت کی موجب ہے کہ حضرت والا کی توجہ اس طرف مبذول ہے اور دعاؤں میں فراموش نہیں فرماتے، فالحمد للہ علی ذالک۔

طالب دعا

ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

حبی ومحبی دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، بڑا اچھا کیا جو آپ رائے بریلی تشریف لے گئے، یہاں سکون بھی ہوگا، اور آب وہوا بھی اچھی ہوگی، چنانچہ آپ نے لکھا ہے کہ مزید صحت حاصل

ہورہی ہے، بڑی مسرت ہوئی، آپ کے لئے دعا کرتا ہوں، اللہ تعالی کامل صحت عطا فرمائے، میں بھی یہاں بحمد اللہ نفع محسوس کررہا ہوں صحت میں نمایاں فرق دیکھ رہا ہوں، آب وہوا اور موسم معتدل ہے، باقی یہاں کا آنا تو ادھر کی گرمی ہی کے خیال سے ہوا ہے کیوں کہ ڈر معلوم ہوا کہ شدت گرمی کی وجہ سے رعاف کا مرض عود نہ کر جائے، اس لئے موسم بدل جانے پر انشاء اللہ فوراً الہ آباد جاؤں گا اور گو یہاں ہوں لیکن دل آپ لوگوں ہی میں لگا ہوا ہے، اس پر یہ پڑھنے کو جس کو ایک طالب نے آج ہی لکھا ہے جی چاہتا ہے ع

ایں قالب فرسودہ گراز کوئے تو دور است

والقلب علی بابک لیلاً ونہاراً

دعاء فرمایئے کہ اللہ تعالی صحت کامل عطا فرمائے، کام کا بڑا حرج ہوا، اب سے کچھ کام کرسکوں اور اس کی بھی دعا کیجئے کہ جب یہاں آ گیا ہوں تو اللہ تعالی یہاں بھی کچھ کام لے لے۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ مئی ۶۶ء

تکیہ رائے بریلی تشریف آوری کی درخواست

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۲ر جون ۱۹۶۶ء ۱۱ر صفر ۱۳۸۶ھ

مخدومنا المحترم و مشفقنا المعظم دامت برکاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شفقت نامہ باعث سرفرازی ہوا تھا، جو عزیز میرے خطوط لکھا کرتے ہیں وہ سفر پر گئے ہوئے تھے اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی، حضرت کی صحت کی ترقی ہم سب

خدام ومحبین کے لئے مستوجب حمد وشکر ہے، اللہ تعالی شکر وقدر کی توفیق عطا فرمائے، یہاں کے قیام میں اس کا قوی تقاضا پیدا ہوا کہ ایک بار یہاں قدم رنجہ فرمانے کی درخواست کروں۔ ع

میرے ویرانہ میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

موسم اچھا ہو اور حضرت کی صحت متحمل ہو تو ایک دو روز کے لئے تشریف لائیں، الہ آباد سے سیدھا راستہ ہے، انشاء اللہ کوئی زحمت نہ ہوگی، اب خاص بستی تک سواری آنے لگی ہے، دروازہ تک کار آسکتی ہے، خدا وہ مبارک دن لائے، امید ہے وہاں کے مخلصین وطالبین ضرور مستفید ہو رہے ہوں گے ع

منعم بہ کوہ ودشت وبیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زدوبار گارہ ساخت

والسلام
طالب دعا
ابوالحسن علی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

حبی ومحبی سلمہ اللہ تعالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محبت نامہ ملا، حالات سے مطلع ہوا، آپ نے رائے بریلی آنے کے لئے فرمایا ہے، وہاں کے لئے تو میں بہت دنوں سے خود ہی ارادہ کر رہا تھا لیکن کوئی نہ کوئی مانع ہوتا گیا، ادھر بیماری سے کچھ اچھا ہوا اور قوت آنے لگی تھی تو رعاف کا دورہ پڑ گیا اور پھر گرمی کی شدت کی وجہ سے یہاں چلا آیا۔

بہر حال میرا ارادہ خود ہی ہے، رہا یہ کہ کب؟ تو اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا، باقی ایک بڑی وجہ ہم جیسے لوگوں کے لئے کہیں آنے جانے سے جو مانع بنتی ہے وہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو کسی کے حالات اور تعلقات کا تو علم ہوتا نہیں، اس لئے وہ ایک جگہ پر قیاس کر کے دوسری جگہوں کے لئے دعوت دینا شروع کر دیں گے۔

دیوبند کے لوگ تیار بیٹھے ہیں، میرے حالات وموانع کو ہرگز لحاظ نہ کریں گے، پھر یہ کہ سفر میں کروں گا اور اہل علم حضرات مجھے لکھ کر بھیج دیں گے کہ تمہارا فلاں سفر میرے ذوق کے خلاف ہوا، سفر میرا اور ذوق ان کا، اب میں کس کس کے ذوق کی رعایت کروں!

ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب اس مسئلہ میں محتاط ہونا ضروری سمجھتا ہوں، آپ کے یہاں پر قیاس کب کر سکتے ہیں مگر بد ذوقی کو کیا کیجئے، ابھی چند روز ہوئے آپ کے مولانا........صاحب کا خط آیا تھا کہ........اس میں تو مضائقہ نہیں معلوم ہوتا کہ جس طرح گرمی کا موسم صحت ہی کے لئے بمبئی کا مناسب تصور فرمایا گیا ہے، اسی طرح غالباً سردی کا موسم اسی غرض سے لکھنؤ کی سعادت کے لئے اختیار فرمایا جا سکتا ہے۔ انتہی۔

میں یہ مضمون دیکھ کر بہت ہنسا کہ مولانا نے خوب قیاس فرمایا، یہاں (بمبئی میں) تو گرمی معتدل ہے لیکن سردی کے اعتبار سے تو الہ آباد اور لکھنؤ دونوں برابر ہیں پھر سردی کو سفر میں کیا ترجیح جب کہ میرا مرض سردی ہی کا ہے، اس موسم میں زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہ آپ کو اس پر سنایا کہ ہم جیسے لوگوں پر عوام وخواص سب کی کڑی نگاہ رہتی ہے، اس لئے بہت سوچ سمجھ کر اور احباب سے صلاح ومشورہ کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتا ہوں، تاہم آپ کے خط سے بہت مسرت ہوئی اور آپ سے کہتا ہوں کہ ارادہ تھا اور اب بھی ہے، دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ صحت عاجلہ کاملہ عطا فرمائیں اور کچھ دین کا کام لے لیں۔

والسلام وصی اللہ عفی عنہ

حضرت شاہ صاحب کی شفقت ونوازش اور حضرت مولاناؒ کا احساس وادراک

مشفق محترم مخدوم معظم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب والا سے رخصت ہوکر اور جلسہ سے فراغت کرکے شب میں دو بجے الہ آباد سے روانہ ہوا، اور راحت وسہولت کے ساتھ تقریباً ساڑھے چھ بجے صبح رائے بریلی پہونچ گیا، یوں تو جب کبھی اللہ تعالی نے خدمت بابرکت میں حاضری کی سعادت نصیب فرمائی، جناب والا نے اپنی شفقتوں سے سرفراز فرمایا، لیکن اس سفر میں خصوصی طور پر عجیب نوازشیں رہیں، اور جن کا لطف اور جن کی حلاوت ابھی تک محسوس ہوتی ہے، اور عرصہ تک انشاء اللہ تعالی باقی رہے گی، باوجود اس کے کہ ہم ناقدروں سے حاضری میں ہمیشہ کوتاہی اور استفادہ میں تقصیر ہوتی ہے، لیکن جناب والا کی نظر عنایت اور توجہات قلبی میں کوئی فرق نہیں، اللہ تعالی جناب کا سایہ ہم سب پر تادیر سلامت رکھے، اس سے بڑی تقویت اور تسکین ہوئی کہ حالات حاضرہ سے قلب مبارک بہت بے چین اور مضطرب ہے، ہم سب کے لئے یہ بات موجب طمانینت اور باعث تقویت ہے۔

طالب دعا

ابوالحسن علی ندوی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا جواب

محبّ مکرم دام حبکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کرامت نامہ مملو از محبت وحلاوت صادر ہوا، جواباً عرض ہے کہ میرا دل اس

بار آپ سے لگ گیا، بہت کچھ امید کام کی ہو گئی، ورنہ سخت اضطراب میں تھا، جزاکم الله تعالی خیرا الجزاء واحسنه.

یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ روز بروز اس حلاوت میں ترقی ہوتی رہے اور یہ دوسروں میں بھی سرایت کرے کہ امت محمدیہ کا کام بن جائے، آنکھیں کام کا انتظار کر رہی ہیں یہی وقت کام کا ہے۔

والسلام خیر ختام
وصی اللہ عفی عنہ

لکھنؤ تشریف آوری سے متعلق حضرت شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی معذرت

(حضرت مولانا وصی اللہ فتح پوری رحمہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک خادم نے مندرجہ ذیل تحریر ارسال کی)

"حضرت نے فرمایا ہے کہ میں گذشتہ دنوں بمبئی آنے سے قبل لکھنؤ گیا تھا، آپ موجود نہ تھے، صرف دو ہی دن ٹھہر کے بعض ضروریات کی بناء پر جلد واپس آنا پڑ گیا، اس وقت لوگوں سے یہ کہا تھا کہ میں انشاء اللہ تعالی علی گڑھ اور لکھنؤ خود سے حاضر ہو جایا کروں گا، چونکہ اب آئندہ ہفتہ الہ آباد آ رہا ہوں، اس لئے خیال پیدا ہوا کہ آپ سے دریافت کروں کہ علی گڑھ کے لوگوں نے تو بہت کچھ قریب ہونے کا ثبوت دیا، معلوم ہوا ہے کہ ہفتہ میں جمع ہوتے ہیں اور میرے رسائل سنتے سناتے ہیں اور وہاں کوئی دینی ادارہ بھی نہیں ہے، اس لئے وہ لوگ دین کے محتاج ہیں، مگر لکھنؤ میں تو ماشاء اللہ علماء اور فضلاء کی ایک جماعت موجود ہے، جو کام کر رہی ہے، مدارس عربیہ موجود ہیں اور دین کا کام ہو رہا ہے، اس لئے میرے آنے کی ضرورت مجھے نہیں سمجھ میں آتی تو میں وہاں کیوں آؤں؟ الحمد للہ صحت گو اب اچھی ہے تاہم سفر وغیرہ سے تعب ہوتا ہی ہے، ضرورت اور نفع

سے تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے، باقی جہاں ضرورت نہ ہو کام ہو رہا ہو وہاں خواہ مخواہ کے لئے اس قدر تعب برداشت کر کے آنا جانا، یہ میرے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، اس کے متعلق آپ کا خیال معلوم کرنا چاہتا ہوں، کچھ ارشاد فرمایئے۔

والسلام خیر ختام

بحکم حضرت والا، بقلم یکے از خدام

لکھنؤ تشریف آوری اور قیام کی مکرر درخواست

تکیہ کلاں رائے بریلی

۱۰/ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۷ھ

۸/ جولائی ۱۹۶۷ء

مشفقنا المحترم ومخدومنا المعظم دامت برکاتہ والطافہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ جناب والا بعافیت الہ آباد تشریف لے آئے ہوں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ مسعود ومبارک فرمائے، اور اہل الہ آباد کو اس نعمت کی قدر کی توفیق عطا فرمائے، جناب والا نے لکھنؤ تشریف آوری سے متعلق استفسار فرمایا ہے، گذارش ہے کہ لکھنؤ بہت سی خصوصیات کی بناء پر اس کا مستحق ہے کہ جناب والا کبھی کبھی تشریف لایا کریں اور چند روز قیام فرمایا کریں، البتہ فوری تشریف آوری کی میری رائے نہیں ہے، اس لئے کہ ابھی سفر کا تعب بھی ہے اور بارش کا تسلسل بھی، ابتداء سرما میں اگر تشریف آوری ہو تو بہت اچھا ہو، انشاء اللہ کام کرنے والوں کی تقویت ہوگی اور ان کے کام میں برکت۔

والسلام مع الاکرام

طالب دعا ابوالحسن علی ندوی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

مجبی سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا جس سے حالات معلوم ہوئے، بمبئی میں کچھ دنوں سے بہت اچھا کام ہورہا ہے، جس کی وجہ سے وہاں کچھ قیام زیادہ رہنے لگا ہے، مگر اپنے دیار اور خاص طور پر الہ آباد، علی گڑھ لکھنؤ اور جون پور وغیرہ کے دوستوں کے تعلق اور اصرار کی وجہ سے کچھ ضروری کام چھوڑ کر ان کی خدمت کے لئے یہاں چلا آیا اور یہ خیال ہوا کہ یہاں آ گیا ہوں تو مختصر مدت میں ان حضرات کی جتنی بھی خدمت ہو سکے وہ کردوں اور پھر بمبئی چلا جاؤں تاکہ وہاں جو کام شروع ہو چکے ہیں وہ خراب نہ ہونے پائیں۔

آپ نے اپنی محبت سے میرے لکھنؤ آنے کے لئے موسم سرما کا ابتدائی بہتر زمانہ منتخب فرمایا ہے مگر ان دنوں شاید یہاں نہ رہوں، اس لئے اس وقت کے لئے معذرت خواہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے موقع نصیب فرمایا تو پھر آپ حضرات کی خدمت کے لئے حاضر ہوجاؤں گا، خدا تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ حضرات کے ذریعہ لوگوں کو دینی نفع پہنچائے۔ فقط

والسلام

وصی اللہ عفی عنہ

۱۲/ جمادی الاخری ۸۷ھ

لکھنؤ تشریف آوری کی مکرر درخواست اور شدید اشتیاق وانتظار

مخدومنا المعظم ومشفق محترم دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ مؤرخہ ۱۲/ربیع الثانی مجھے ۲۶/ربیع الثانی کو رائے بریلی آنے پر ملا میں دو ہفتے رائے بریلی سے باہر رہا، اس لئے مکتوب گرامی تاخیر سے ملا۔

میں نے جناب والا کے سفر کے تعب اور بارش کے موسم کا خیال کر کے لکھ دیا تھا، لکھنؤ میں مشتاق صاحب سے ملاقات ہوئی، معلوم ہوا کہ ان مخلصین ومحبین نے ایک مکان بھی تجویز کرلیا ہے، مولانا منظور صاحب نے بھی مکتوب گرامی دکھایا، اب میری ناچیز رائے ہے کہ حضرت اسی موسم میں تشریف لے آئیں، معلوم نہیں کیا موانع پیش آجائیں، انشاء اللہ ہر طرح خیر و برکت ہوگی اور کام کرنے والوں کو بھی تقویت اور سرپرستی حاصل ہوگی، میں بھی داعیوں کی دعوت میں شریک اور موید ہوں، امید ہے کہ سب کی درخواست قبول فرمائی جائے گی۔

والسلام مع الاکرام

طالب دعا ابوالحسن علی

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب

محبی دامت عنایتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں ۲۴/جولائی ۶۷ء کو ''جون پور'' گیا تھا، پھر وہاں سے واپس ہوکر الہ آباد

آیا، چند یوم کے بعد گوپا گنج چلا گیا، وہاں سے واپسی پر مولانا محمد منظور نعمانی کا خط ملا کہ:

''۱۰؍اگست بروز جمعرات ہم دونوں کو دہلی جانا ہوگا اور اس کا امکان ہے کہ وہاں سے بیرون ملک ایک طویل سفر کرنا پڑ جائے، انتہی۔

چونکہ اپنے اسفار کے بعد کچھ آرام کرنا بھی ضروری تھا اس لئے فوراً تیسرا سفر مناسب نہیں معلوم ہوا، اب آپ کا دعوت نامہ ملا ادھر ۳۰؍اگست کو بمبئی کے لئے روانگی کا ٹکٹ لیا گیا ہے، تاہم آپ اگر فارغ ہوں تو تشریف لاویں کہ آپ ہی کے ہمراہ لکھنؤ کا ارادہ کروں۔

یا آپ اگر نہ آسکیں تو یہ فرمادیں کہ ادھر آپ کا قیام لکھنؤ میں رہے گا یا نہیں تا کہ میں ہی آجاؤں۔ بہر حال وقت تو کم ہے مگر آپ کی خاطر عزیز ہے، اس لئے جو فرمایئے گا کروں گا۔

والسلام خیر ختام

وصی اللہ عفی عنہ

شنبہ ۱۲؍اگست ۶۷ء

محی السنۃ حضرت مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ کے نام مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی

مخدومی ومحترمی جناب مولانا ابرار الحق صاحب اطال اللہ بقاءہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج بعافیت ہوں گے اور رمضان المبارک کے تمام معمولات چل رہے ہوں گے۔

ایک جرأت کرر ہا ہوں کہ ایک رقم ذاتی اپنی رقم میں سے آپ کی خدمت میں ارسال کرر ہا ہوں تا کہ ماہ مبارک میں صرف ہو، امید ہے کہ قبول فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے۔

والسلام مع الاکرام
دعا گو وطالب دعا
ابوالحسن علی ندوی
۱۱رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ

محی السنۃ حضرت مولانا الشاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کا مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخدوم گرامی منزلت مربی جلیل حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب حقی مدظلہ العالی
ودامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعاؤں کی درخواست کے ساتھ عرض ہے کہ خدا کے فضل وکرم سے یہ نیاز مند اور دیگر اہل تعلق بخیر ہیں، گذشتہ ہفتہ ہمارے حلقہ کے ایک صاحب جو تہجد گذار نوجوان دیندار، مخلص اور مدارس دینیہ کے بڑے ہمدرد تھے مولوی محمد رضوان ندوی ایک حادثہ میں انتقال کرگئے، ان کے لئے دعا کی درخواست ہے، اوران کے چھوٹے بڑے دینی اور تعلیمی کاموں کی تکمیل کی بھی دعاء کی درخواست ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی مدظلہ العالی جناب کا تذکرہ وقتاً فوقتاً کرتے

ہیں، اور اظہار تعلق فرماتے ہیں، اسی سلسلہ کی بات ہے جس کے لئے عزیزی مولوی عبد اللہ حسنی سلمہ خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں، یہ خود حضرت سے دعا لینے کیلئے حاضر ہونے والے تھے کہ ساتھ ساتھ یہ مذکورہ کام بھی انجام دے سکیں گے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب کی طبیعت گذشتہ مہینہ بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی اور کئی گھنٹے تشویش ناک رہی پھر اللہ تعالی کا خصوصی فضل ہوا اور طبیعت بہتر ہوئی لیکن کمزوری اور بعض دیگر باتیں ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً فکر ہو جاتی ہے، دعاء کی خصوصی درخواست ہے، جناب کی صحت کے لئے ہم سب دعاء کرتے ہیں جو ہم سب کے لئے اور ساری ملت کے لئے قیمتی سرمایہ ہے اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ تادیر قائم وسلامت رکھے اور ہم لوگوں کو تقویت اور اس نعمت سے فائدہ اٹھانے سے کی سعادت حاصل رہے۔

والسلام

خادم وطالب دعا

رابع حسنی ندوی

یکم رجب ۱۴۲۰ھ

ضمیمہ

ازمولانا سید محمود حسن صاحب ندوی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بعض خلفاء اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا باہمی ربط

حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا جو ربط وتعلق رہا، وہ صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء تک متعدی ہوا۔

اس سلسلہ میں چند ان ممتاز خلفاء کا تذکرہ کیا جاتا ہے جن سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا خصوصی ربط وتعلق رہا اور ان حضرات کو حضرت مولانا علی میاں رحمہم اللہ سے محبت وعقیدت تھی۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی مہتمم دارالعلوم دیوبند

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب دیوبندی گوناگوں کمالات کی حامل شخصیت تھے، وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا بڑا احترام فرماتے، اور ان کی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ اس بات کا اظہار اس مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی کی دارالعلوم دیوبند کے لئے ضرورت محسوس کرتے ہوئے ان کے شیخ ومرشد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کو تحریر کیا ہے اور اس تجویز کی تائید کے لئے بطور خصوصی حضرت مولانا علی میاں ندوی کا نام حضرت

شیخ کو لکھا ہے، یہ مکتوب ماہنامہ ''المحمود'' جامعہ محمودیہ ہاپوڑ کے ایک شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔اور اس بات سے بھی حضوصی تعلق و محبت کا اظہار ہوتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت قاری صاحب نے حضرت مفکر اسلام سے فرمایا کہ رائے بریلی میں (تکیہ پر) آپ کے ساتھ رہنے کو جی چاہتا ہے، حضرت مولانا ندوی حضرت قاری صاحب کو ایک بڑے ہی مبارک شخص اور غیر معمولی انسان کی نظر سے دیکھتے تھے اور بڑے احترام و عقیدت کا معاملہ رکھتے تھے۔ان کی وفات پر فوری طور پر ایک خصوصی تحریر اخبارات کے لئے ارسال کی اور پھر مستقل مضمون لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا، اور ان کے اخلاف و فرزندان بالخصوص حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مدظلہ کے ساتھ تعلق و محبت کا معاملہ رکھتے رہے۔اور ان کو اہم جگہوں پر اہمیت دیتے رہے ان کی جگہ پر ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کا انہیں رکن منتخب کیا، مزید آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں نائب صدر کی جگہ دی کہ جس کے حضرت قاری صاحب صدر رہ چکے تھے، حضرت مولانا ندوی حضرت قاری صاحب کے ساتھ تعلق کو دو حیثیتوں سے دیکھتے تھے ایک تو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے رشتہ سے اور دوسرے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے تعلق سے، ان دونوں تعلق کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا ندوی کے مضمون سے دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں جو اس پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں وہ رقمطراز ہیں:

''قاری صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دارالعلوم دیوبند کو ایک ہر دلعزیز ادارہ بنا دیا، اور دارالعلوم کو بغیر کسی اختلاف کے عوام سے متعارف کرایا اور ان کا اس سے تعلق پیدا کیا، تقسیم سے پہلے تحتی براعظم کے دورے کئے، تقسیم کے بعد پاکستان بار بار گئے، جنوبی افریقہ کا دورہ کیا، انگلستان گئے اور آخر میں امریکہ گئے''۔

''قاری صاحب عوام کی اصلاح اور وعظ و ارشاد میں شیخ وقت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اسلوب کے متبع تھے، حسن تقریر اور دعوتی و اصلاحی رنگ ان کا امتیاز تھا، جس سے ہزاروں انسانوں کو فائدہ پہونچا، ہزاروں دلوں میں دین

کے احترام کا جذبہ اور علماء کے متعلق حسن ظن پیدا ہوا، ایسا خوش بیان مقرر وواعظ وسیع المعلومات اور نورانی شکل کا عالم مشکل سے دیکھنے کو ملتا تھا، جس پر پہلی نظر پڑتے ہی قلب شہادت دیتا کہ یہ فطرتاً معصوم ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ضرر پہونچانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے"۔[1]

آگے لکھتے ہیں:

قاری صاحب خانوادۂ بانی دارالعلوم دیوبند کے چشم وچراغ تھے، اور راقم سطور حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، جن سے مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی کا تعلق عقیدت کا نہیں بلکہ عشق کا تھا، اوراس کا اندازہ راقم سطور کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء) کی کتاب "دہلی اوراس کے اطراف" سے ہوسکتا ہے جس میں مولانا نے اپنے دیوبند اور گنگوہ کی حاضری اور وہاں کے بزرگوں اور قابل احترام ہستیوں کے سید صاحب کے ساتھ اظہار عقیدت ومحبت کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، قاری صاحب سے وفات سے چند دن پہلے جب لکھنؤ میں ایک تقریب میں (جس میں ان کو کسی ادارے یا مکان کے سنگ بنیاد رکھنے کی زحمت دی گئی تھی) ملاقات ومصافحہ کا شرف حاصل ہوا، مصافحہ کرتے وقت فرمایا کہ کچھ دن آپ کے ساتھ رائے بریلی رہنے کو جی چاہتا ہے، وکفیٰ بہ شرفاً[2]

---

[1] پرانے چراغ حصہ سوم ص ۱۴۳ [2] پرانے چراغ حصہ سوم ۱۴۴۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی

مفتی اعظم پاکستان

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلفاء میں ایک ممتاز ترین نام حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کا بھی ہے جو پاکستان بننے کے بعد اس کے پہلے مفتی اعظم ہوئے وہ مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی کے نہ صرف قائل بلکہ ان کے مقبولیت عنداللہ کے بھی معترف تھے، ان کے نامور صاحبزادے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے ایک سے زائد جگھوں پر بیان کیا اور تحریر بھی کیا ہے کہ وہ انہیں موفق من اللہ کہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا ندوی کا حضرت مفتی صاحب سے عقیدت ومحبت کا تعلق تھا اور اسی نسبت سے وہ ان کے قائم کردہ ادارے دارالعلوم کراچی سے بھی تعلق رکھتے تھے وہاں تشریف بھی لے گئے اور خطاب بھی فرمایا، خطاب کا وہ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جو حضرت مفتی صاحب سے متعلق ہے، حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس سرہٗ نے فرمایا تھا کہ:

”میں اس دور کے جن علماء کے رسوخ فی العلم اور تبحر کا معتقد وقائل ہوں ان میں اس دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ کا خاص مقام ہے، علمی تبحر فقہ وفتاویٰ پر وسیع اور گہری نظر، قوت تدریس یہ سب چیزیں بھی قابل قدر اور قابل احترام اوصاف کمالات ہیں۔ لیکن ایک دوسری چیز ہے جس کی بناء پر کسی فقیہ ومفتی کو ”فقیہ النفس“ کہتے ہیں، یہ امتیاز علماء زمانہ میں حضرت مفتی صاحب کو حاصل تھا، وہ میرے اساتذہ کی عمر اور صف کے بزرگ تھے، یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے براہ راست ان سے درسی طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملا، جب میں دیوبند پہنچا تو حضرت مفتی صاحب وہاں

درس دیتے تھے لیکن میں چونکہ صرف دورہ کے اسباق میں شریک ہوتا تھا اس لئے مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہ ہوا۔

میں نے بائیس ۲۲ برس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا ہے، ۱۹۵۶ء میں ایک بیرونی سفر سے آتے ہوئے دو تین دن کے لئے کراچی ٹھہرا تھا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس نے ان کی اس بہترین یادگار دار العلوم میں پہنچایا۔ [1]

مولانا ظفر احمد عثمانی و مولانا محمد یوسف بنوری

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں ان دو بزرگوں کا تعلق و اعتماد بھی حضرت مولانا ندوی کو حاصل رہا، اور ان کی شفقتیں حاصل کیں، اور یہ دونوں عظیم شخصیتیں بھی حضرت مولانا ندوی کی قدرداں رہیں، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے اپنی کتاب حضرت مولانا ندوی کو ہدیہ کی تو اس پر حضرت مولانا کے نام کے ساتھ ''آیة من آیات اللہ'' کا جملہ بھی تحریر فرمایا۔ یہ ایک بڑا اعتراف اور اہم شہادت تھی یہ نسخہ مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظمی کے پاس محفوظ ہے۔ ان دونوں عظیم علمی و دینی شخصیتوں کو مولانا ندوی نے جن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے بطور نمونے کے وہ الفاظ ذکر کئے جارہے ہیں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

''اس وقت پاکستان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسے راسخ فی العلم والدین علماء کی ضرورت تھی واقعہ تو یہ ہے کہ حالات و مسائل ایسے ہیں کہ اس وقت اس ملک اور اس عہد کو حجة الاسلام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ کی ضرورت تھی، لیکن اگر اس پایہ کے علماء اور دینی رہنما نہ ہوئے تو کم سے کم ان حضرات کے پایہ کے علماء تو ہوتے جن کا

---

[1] دعوت فکر و عمل حدیث پاکستان ص ۱۹۶۔

میں نے ذکر کیا، مگر افسوس کہ اس وقت وہ بھی ہم میں موجود نہیں''۔[1]

مولانا سید سلیمان ندوی ومولانا عبدالباری ندوی

ندوی التعلیم شبلی القلم یہ دونوں عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیتیں بھی تھانویؒ المشرب بنیں، اور اپنے استاد وادارے کا بھرپور اعتماد حاصل کرنے کے بعد اپنے شیخ ومرشد کا تعلق اعتماد اور محبت حاصل کی، اور اجازت بیعت وخلافت سے سرفراز ہوئے مولانا عبدالباری ندوی کی ایک کتاب ''مذہب وعقلیات'' کے مطالعہ کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اسے ''اسلام کا آہنی قلعہ قرار دیا۔ اور دوسری طرف علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے اخلاق اور علم ومعرفت کا مشاہدہ کرکے ان کے تعلق سے شعر کہا اس طرح تصوف نے ایک نئی تاریخ رقم کی کہ شیخ اپنے مرید کی شان میں کلمات مدحت ومنقبت کہے۔

ان دونوں بزرگوں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا گہرا ربط وتعلق رہا جو علمی ودینی استفادہ تک ہی محدود نہ رہا بلکہ عزیزانہ روابط تک متعدی ہوا خود حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی سے ہمارے خاندان کے ایسے گوناگوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے ....وہ میرے والد کے عزیز شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے جو عمر میں بڑے اور فضیلت وشہرت میں بڑھے ہوئے تھے، ہماری درسگاہ (دارالعلوم ندوۃ العلماء) کے ایک طرح کے مربی وسرپرست بھی تھے[1]

مولانا عبدالباری صاحب کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

---

[1] حوالہ سابق ص ۱۹۷۔[2] [1] ص ۱۷اج اپرانے چراغ

"مولانا عبدالباری صاحب و برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب میں بڑے گہرے روابط و تعلقات تھے دونوں میں کئی باتیں مشترک تھیں اور یہی مناسبت و اتحاد کا ہمیشہ سے قوی ذریعہ رہا ہے، دونوں معاملات اور حقوق العباد میں بہت محتاط اور ذکی الحس واقع ہوئے تھے دونوں مظاہر و اشکال اور لوگوں کی تعریف و تنقید سے بے نیاز ہو کر شریعت کے حکم پر عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور فرائض کو نفلی عبادتوں اور تکمیلی چیزوں پر ترجیح دیتے تھے............

مولانا عبدالباری صاحب نے بھائی صاحب مرحوم کو اپنا مستقل معالج بنا رکھا تھا ....وہ وحدت مرشد کے بھی قائل تھے اور وحدت معالج کے بھی، مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے انہوں نے بھائی صاحب کو اپنا مشیر بھی بنا لیا تھا، اخیر زندگی میں بھائی صاحب اور ان کے گھر سے ان کا تعلق بہت بڑھ گیا تھا ہم میں سے کوئی چلا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور بڑی شفقت و اعزاز کا معاملہ فرماتے" [1]

جہاں تک ان دونوں سے تعلیم و استفادہ کا تعلق ہے تو حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ نے دونوں سے خصوصی طور پر قرآن مجید میں استفادہ کیا۔ مولانا عبدالباری ندوی جب حیدر آباد سے لکھنؤ واپس آ گئے تھے اور اپنے مکان سے قریب ندوۃ العلماء کے رخ پر واقع ایک مسجد میں درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی خصوصی استفادہ کے طور پر آتے اور حلقہ درس میں شریک ہوتے، یوں الگ سے بھی ان سے استفادہ کرتے۔

جہاں تک علامہ سید سلیمان ندوی کا تعلق ہے تو ان سے استفادہ کے مواقع اور زیادہ ملے اور باقاعدہ تلمذ کا شرف بھی حاصل کیا ان سے بھی قرآن مجید کے سلسلہ میں خصوصی طور پر استفادہ کیا، جس کا اظہار انہوں نے اس طور پر کیا ہے:

---

[1] پرانے چراغ ص ۱۲۷۔۱۲۸ ج ۲۔

’’مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا، اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا، جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا، یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی براعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعہ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا‘‘ [1]

زندگی کے مختلف موڑوں میں ان دونوں بزرگوں کی توجیہات حضرت مفکر اسلام کو حاصل ہوئیں اور ان دونوں نے حضرت مفکر اسلام کا عنفوان شباب سے احترام وخیال رکھا، حضرت مولانا عبدالباری ندوی کا تعلق تو یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ انہوں نے جب مذہب وسائنس جیسی معرکہ اراء کتاب لکھی تو اس کا انتساب انہوں نے جن شخصیات کی طرف کیا ان میں ایک نام حضرت مفکر اسلام کا بھی رکھا، اور اپنی بیماری میں اس بات کی وصیت کی کہ ان کی نماز جنازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب پڑھائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا حضرت مولانا علی میاں کے الفاظ ہیں: ان کی وصیت کے مطابق نماز جنازہ کی سعادت ان کے اس نیازمند کے حصہ میں آئی [2]

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کی دو کتابوں ’’سیرت سید احمد شہید‘‘ اور ’’مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت‘‘ نامی کتابوں پر بڑے طاقتور مقدمے لکھے جس میں انہوں نے خود مصنف کتاب کو جو داد تحسین دی ہے وہ ان کے نزدیک مصنف کے مجمع الکمالات ہونے کی دلیل ہے جس کی اصل شہادت

---

[1] دعوت فکر وعمل ص ۱۸۸ مجلس تحقیقات نشریات اسلام لکھنؤ [2] پرانے چراغ ص ۲۹ ج ۲۔

ان کے شیخ حضرت حکیم الامتؒ نے مولانا علی میاں کو ایک خط میں مجمع الکمالات کے خطاب سے یاد کر کے دی تھی،

علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالباری ندوی دونوں کا حضرت مولانا حکیم الامت تھانویؒ سے تعلق بڑا گہرا قوی اور مستحکم تھا، جب ان دونوں کا تعلق حضرت تھانویؒ سے قائم ہوا بھی نہیں ہوا تھا اس وقت سے حضرت تھانویؒ کی ان پر نظر تھی، مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ''مذہب وعقلیات'' جب حضرت تھانویؒ نے پڑھی تو مصنف کے متعلق بڑی اونچی رائے قائم کی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی فرماتے ہیں:

''حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ یہ رسالہ پڑھا تو کسی سے کہا کہ یہ شخص عارف معلوم ہوتا ہے'' مولانا ندوی مزید فرماتے ہیں کہ ''یہ سند اس شخص کی ہے جو عارف باللہ تھا، اور اپنے زمانہ کا سرخیل مشائخ''[1]۔

بعد میں یہ تعلق ارشاد و استرشاد کا ہوا، مولانا علی میاں صاحب کا اعتراف ملاحظہ ہو:

''مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ حضرت تھانویؒ سے ان کا تعلق ایسا ہی تھا جیسے ایک ادنیٰ مرید کا ہوتا ہے وہ ان کو اپنا حقیقی شیخ مانتے تھے، پھر مولانا تھانویؒ نے کچھ عرصہ بعد اطاعت وانقیاد کا مادہ دیکھ کر ان کو اجازت دی''[2]

مولانا سید سلیمان ندوی کے متعلق اپنے اسی خطاب میں فرمایا:

''ہمارے اس دور مادیت والحاد میں امام غزالی کی علوئے ہمت اور حسن طلب کی دو مثالیں ہمارے حلقہ میں ہمارے سامنے گذری ہیں ایک مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے مولانا عبدالباری ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی ہمارے عہد کے عظیم ترین مصنف تھے ان کی تصانیف مقدار کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں، اور تنوع کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور پھر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں، جن کی شہرت سے

---

[1] تعمیر حیات ۱۰ ر فروری ۱۹۷۶ء [2] تعمیر حیات ۱۰ ر فروری ۱۹۷۶ء۔

مستشرقین بھی مرعوب تھے اور اپنے سوالات کے جوابات ان سے مانگتے تھے، عربوں نے بھی ان کا لوہا مان لیا تھا، وہ تھانہ بھون گئے، اور پھر اس طرح اپنے کو ڈال دیا کہ حضرت تھانویؒ کو یہ کہنا پڑا، ؎

از سلیمان گیرا خلاص عمل   داں تو ندوی را منزہ از دغل

مجھے خوب معلوم ہے کہ کسی شیخ نے اپنے ایک مسترشد کی ایسی مدح کی ہو جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے مولانا سید سلیمان ندوی کی کی ہے، اور ان کو اتنی جلدی خلافت دی کہ ان کے پرانے اصحاب کو تعجب ہوا۔[1]

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب

ناظم (سابق) مظاہر علوم سہارن پور

حضرت مولانا محمد اسعد اللہ صاحب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ممتاز خلفاء میں ایک تھے، حضرت کے بعض خلفاء نے بھی ان سے استفادہ کیا، حضرت مولانا ابرار الحق صاحب حقی نے حضرت تھانویؒ کے لکھنؤ کے قیام کے زمانہ کے جو ملفوظات جمع کئے تھے اس پر حضرت تھانویؒ کا ایماء پا کر حضرت مولانا اسعد اللہؒ نے نظر ڈالی پھر ان دونوں مناسبتوں سے اس مجموعہ ملفوظات کا عنوان حضرت حکیم الامتؒ نے "اسعد الابرار" رکھا، حضرت مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی سہارنپور جب تشریف لے جاتے تو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے مہمان ہوتے وہاں حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب بھی تشریف لاتے حضرت مولانا علی میاں ندوی کی ان سے ملاقات ہوتی اور موقع ہوتا تو ان سے ملنے ان کی جگہ پر بھی جاتے، ان کی حضرت مولانا علی میاں کے دل میں ہمیشہ بڑی قدر و منزلت رہی اور وہ بھی حضرت مولانا کے ساتھ

---

[1] تعمیر حیات ۱۰ فروری ۱۹۷۶ء

بڑے احترام کا معاملہ کرتے ،اسی لئے ان کے خلفاء ومسترشدین نے بھی حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ محبت وتعلق اور عقیدت کا معاملہ رکھا جن میں خصوصیت سے حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب کا نام قابل ذکر ہے ،جن سے حضرت مولانا علی میاںؒ کو بھی صرف محبت وتعلق ہی نہیں عقیدت بھی رہی ، اور ان کی وفات پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ایک بڑی پر اثر تقریر بھی فرمائی اور ان کی وفات کو ایک عالم ربانی کی وفات قرار دیا۔ اپنی خودنوشت سوانح حیات کاروان زندگی حصہ ہفتم میں ان پر مضمون بھی لکھا۔ جس کے ایک ایک لفظ سے گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کے دیگر خلفاء وتلامذہ میں حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور کا بھی حضرت مولانا سے قلبی لگاؤ رہا۔ اور حضرت مولانا علی میاں کے دل میں بھی ان دونوں کی ہمیشہ قدرومنزلت رہی ، اور بعض علامتوں کے ذریعہ تعلق کا اظہار بھی کیا حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سے حضرت مولانا علی میاں کی مراسلت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سلسلہ میں راقم کو ایک خط دستیاب ہوا جو حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کا جوابی طور پر تحریر کردہ ہے، تبرکاً یہاں نقل کیا جارہا ہے۔ جوابی کارڈ حضرت مولانا علی میاں ندوی نے خود ہی ارسال کیا تھا اور اپنے پتہ میں نام ابوالحسن علی لکھا حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نے اس کو اس طرح مکمل کیا حضرت مولانا علی میاں ابوالحسن علی صاحب مدظلہٗ العالی، خط اس طرح ہے:

مظاہر علوم ۳/اپریل ۱۹۶۸ء

حضرت مخدومی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

۱۲/۲/۸۷ھ کا والا نامہ عزت بخش ہوا تھا ، تاخیر جواب کے لئے بہت نادم وشرمندہ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مختلف مجبوریاں ومعذوریاں لاحق تھیں اور ہیں۔

حضرت مولانا حاجی حافظ مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم میرے حقیقی دادا کے بڑے حقیقی بھائی تھے، میری اہلیہ ان کی حقیقی پوتی ہیں، ۱۲۹۴ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے،

ظہیر الحق تاریخی نام ہے، ربیع الثانی کی اکیسویں تاریخ بروز دوشنبہ ۱۳۲۱ھ کو انتقال ہوا، (تذکرہ کاملان رامپور مؤلفہ حاجی احمد علی خاں شوق ۳۳۸،۳۹،۳۰) اس تذکرہ میں حضرت مفتی صاحب کے احوال اور کچھ لکھے ہوئے ہیں، اگر ارشاد ہوگا تو نقل کرا کے بھیج دوں گا، شاہ بغدادی صاحب کے مزار میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے (تذکرہ مذکورہ)

جناب کے سب متعلقین کی خدمت میں سلام مسنون ودرخواست دعا، باوجود مجبوری ومعذوری کے تاخیر جواب کی دوبارہ معذرت خواہ ہوں۔ والسلام

محمد اسعد اللہ

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی

عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے نامور اور کثیر الافادہ خلفاء میں سے ایک ہیں جن کو اللہ نے اچھی عمر عطا کی اور اپنے عہد کے مرجع بنے، اور ان کو خواص وعوام دونوں کی مرجعیت حاصل ہوئی، تکمیل سلوک کے لئے بعض بڑے مشائخ کے خلفاء نے بھی ان سے تعلق جوڑا۔ صاحب اقتدار وسطوت بھی آپ کے یہاں نیاز مندانہ وخادمانہ حاضری کو اپنے لئے باعث شرف وسعادت جانتے، اس سلسلہ میں خصوصیت سے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہید کا نام نمایاں ہے، شہرہ آفاق علماء ومفکرین اور نامور مصلحین بھی اپنی مشغولیت سے وقت نکال کر حاضری دیتے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کراچی میں منعقد ایک انٹرنیشنل کانفرنس میں ۱۹۷۸ء میں شرکت کے لئے آئے جس کا اہتمام رابطہ عالم اسلامی نے کیا تھا، تو ان کا چند روزہ قیام نہایت مشغولیت کا تھا، وقت نکال کر حضرت عارفی کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اس کو اپنے لئے باعث شرف وسعادت جانا اور اس سعادت کا اپنی کتاب کاروان زندگی (دوم) میں اہتمام سے ذکر کیا، حضرت ڈاکٹر صاحب کی ان کو شفقتیں حاصل ہوئیں، حضرت ان کی خدمات

وکارناموں سے واقف تھے، اوران سے تعلق خاطر رکھتے تھے، اپنی کتاب اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عربی ایڈیشن ان کی نظر سے گذارنے اور مقدمہ تحریر کرنے کے لئے بھیجی، اس سے متعلق حضرت کا مکتوب راقم کے پاس محفوظ ہے۔اس کی اہمیت کے پیش نظراس کا متن پیش خدمت ہے۔ محمد عبدالحیٔ عُفی عنہ

محترمی ومشفقی ومحبی زید مجدکم وعرفانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر وعافیت ہوں، بفضلہٖ تعالیٰ ہم لوگ بھی مع الخیر ہیں،

آپ کے مشاغل اوراوقات گرانقدر کا اندازہ کرتے ہوئے ہمت تونہیں ہوتی کہ اپنی کوئی استدعا پیش کروں، لیکن معاملہ کچھ ایسا ہے کہ بغیراس کے کوئی چارہ کارنہیں اس لئے آپ کی توجہات کرم جواس ناکارہ دورافتادہ کے ساتھ ہیں اس سہارے پر بہت امیدوں کے ساتھ ایک عرض پیش کررہاہوں، امید ہے کہ ضرورشرف قبولیت عطافرمایاجائے گا۔

ایک تالیف اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی نظر سے امید ہے گذرچکی ہوگی ،اب تک الحمدللہ آٹھ سال کے عرصہ میں چالیس ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، متعدد زبانوں میں تراجم بھی (فارسی ، ہندی، گجراتی، انگریزی) ہوچکے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار احسان وانعام ہے کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ شائع ہوگیاہے، جواس وقت ہدیہ پیش خدمت کررہاہوں، اس کی اشاعت توعربی ممالک ہی میں ممکن ہوگی،

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل وکرم سےاس دور حاضر میں آپ کے قلب اورزبان وقلم کوایسی خصوصیات واوصاف سے متصف فرمایاہے، جواپنی شان میں بالکل منفرد ہے وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

ماشاء اللہ آپ ہمہ وقت تبلیغ واشاعت دین میں مشغول ہیں ، اللہ تعالیٰ شرف قبولیت عطا فرمائے اللّٰھم زدفزد۔

ممالک عربیہ خصوصاً حجاز میں آپ کی خدمات تبلیغ کا بہت نمایاں اثر ہے، اس توقع پر کہ اگر آپ اس کتاب پر بطور تقریظ یا مقدمہ چند سطریں بطور تعارف تحریر فرمادیں تو انشاءاللہ اس کتاب کی اشاعت ان ممالک میں بہت نافع ثابت ہوگی۔

وما علینا إلا البلاغ المبین۔

امید ہے کہ اس ناکارہ کی اس استدعا کو آپ ضرور شرف قبولیت عطا فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے، اللہ تعالیٰ آپ کے مراتب علمیہ بلند فرماویں آمین۔ احقر محمد عبدالحی عفی عنہٗ

اس مکتوب عالی سے جانبین کے مابین جس تعلق و محبت کا پتہ چلتا ہے وہ سطر سطر سے ظاہر ہے، یہی نہیں بلکہ حضرت ڈاکٹر صاحب عارفی کی شفقتیں حضرت مولانا علی میاں ندوی کے خوردوں کو بھی حاصل ہوئیں خصوصیت سے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی دامت برکاتہم کو جن کو حضرت مولانا نے اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کام میں شریک فرمایا تھا، اور اسی طرح حضرت مولانا علی میاں صاحب ندویؒ کا تعلق حضرت عارفی کے بعض خلفاء و مسترشدین کو خصوصیت سے حاصل رہا۔ جن میں نامور عالم دین جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی دام مجدہٗ و مولانا محمد یوسف لدھیانوی مرحوم اور قاری سید رشید الحسن صاحب مرحوم (سابق امام و خطیب جامہ مسجد علامہ بنوری ٹاون کراچی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ ان حضرات کو بھی حضرت مولانا علی میاں ندوی سے والہانہ تعلق رہا ہے، یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب نے اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عربی ایڈیشن کے علاوہ اس کے ایک اردو نئے ایڈیشن کے لئے مقدمہ تحریر فرمایا تھا جو دہلی کے ایک مکتبہ سے شائع ہوا، اور بڑا ہی طاقتور مؤثر و ایمان افروز تھا۔

تذکرہ مصلح الامت حضرت وصی اللہ صاحب فتح پوری

مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری ثم الہ آبادی حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی خلفاء میں سے ہیں۔اوران مشائخ کبار میں سے ہیں جن کی خدمت میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے حاضری کا معمول رکھااوراپنے ذاتی ودینی مسائل میں مشورے بھی لئے ،حضرت مصلح الامت کے ''قلب'' پران کے تعلق ومحبت کا اثر تھااوراس اثر کوانہوں نے ایک موقع پر یوں ظاہر بھی فرمایایہ کہہ کرسب کودیکھ لیاسب کودیکھ لیاعلی میاں کادل آئینہ ہے۔

جن صاحب نے حضرت کو یہ فرماتے سناانہوں نے مولاناابوبکرحسنی رحمۃ اللہ سے بیان کیاانہوں نے ہم لوگوں کو یہ بتایا۔

راقم نے اپنے دادا جناب سید محمد مسلم حسنی صاحب سے بھی مولانا ابوبکر حسنی کی روایت سے یہ واقعہ سنا۔

مولاناسیدابوالحسن علی ندوی ان کی خدمت میں حاضری اورشفقتوں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں،''پہلی حاضری میں ہی انہوں نے ایسی خصوصی شفقت فرمائی کہ مجھے بھی حیرت اورشرمندگی ہوئی'' مولانا کے فتح پور منتقل ہوجانے کے بعد گورکھپور پھرالہ آباد جہاں مستقل قیام فرمالیا تھا،، وقفوں کے بعدحاضری ہوتی رہی ،بمبئی کے قیام میں بھی جہاں سے آخرمیں مولانا کاخاص ربط پیدا ہوگیا تھا،حاضری دیتارہا،الہ آباد جاتا تو مولانا کا ہی مہمان ہوتا ، اورمولانا کی شفقتوں کے عجیب انداز اور ادائیں دیکھتا ، خط وکتابت بھی رہی ،ایک مکتوب میں تحریر فرمایا''جوحضرات میرے پاس آمدورفت فرماتے ہیں ان میں غالباًسب سے زیادہ قلب کارجحان جناب ہی کی طرف ہوتاہے''

محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق صاحب حقی

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب حقی رحمۃ اللہ علیہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے آخری اور مرجع خلائق خلیفہ تھے، اپنے شیخ ومرشد کے اصولوں کا پابندرہ کر سنن نبویہ (چھوٹی ہوں یا بڑی) کی اتباع میں اپنی پوری زندگی گذاردی، احیاسنت کی انہیں ہردم فکر رہی اس لئے وہ احیاءسنت کے علمبردار کہلائے، محی السنہ کا انہیں امت نے خطاب دیا۔
علماء کی قدراور مشائخ وقت کی خدمت میں حاضری میں وہ ممتاز رہے، آخر میں وہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کی خدمت میں وقتاً فوقتاً الہ آباد اور کبھی ان کے آبائی وطن پھولپور جاتے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب تھے جب بھی وقت میں گنجائش ہوتی اور لکھنؤ سے گذرنا ہوتا تو ملاقات کے لئے تشریف لاتے، آخری بار ملاقات کے لئے تشریف لائے تو حضرت مولانا علی میاں ندوی نے ان سے دعا کے لئے کہا اور فرمایا کہ مغفرت کے لئے دعا کیجئے گا، اس کے بعد پھر ملاقات کا کوئی دوسرا موقع نہ نکل سکا، ان دونوں بزرگوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے قیام لکھنؤ (۱۹۳۸ء) کے وقت سے قائم تھا، جو ۱۹۹۹ء تک یعنی ساٹھ سال سے زائد عرصہ تک قائم رہا، یہ ملاقاتیں زیادہ تر مشائخ وقت کے یہاں حاضری کے موقع پر ہوا کرتیں جیسے سہارنپور میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے یہاں، الہ آباد میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کے یہاں، حضرت شاہ وصی اللہ صاحب سے بمبئی میں آخری ملاقات کے وقت یہ دونوں بزرگ اور حضرت مولانا منظور نعمانی موجود تھے، پھر حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کا سفر حج ہوا اور راستہ میں انتقال ہوگیا۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتابگڈھی کے یہاں اس کے مواقع حاصل ہوئے، حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ ان دونوں بزرگوں کا بڑا ہی خیال اور لحاظ فرماتے تھے، اس کے علاوہ بعض دینی واصلاحی پروگراموں

میں بھی ملاقاتوں کے مواقع نکل آتے۔اور یہ دونوں خطوط کے ذریعہ بھی ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرتے، دونوں ایک دوسرے کا بڑا احترام کرتے اور احترام و محبت کا یہ تعلق دونوں کے اپنے اپنے مقام و مرتبہ اور دینی خدمات کی وجہ سے بھی تھا، اور ان کی اپنی خاندانی وروحانی نسبتوں کی وجہ سے بھی، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی اولاد میں تھے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی یادگار، دوسری طرف حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تھے اور حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کی یادگار، دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مکتوب یا تحفہ کو بسر و چشم قبول کرتے اور دونوں ایک دوسرے کی نسبت کا بھی پورا لحاظ کرتے۔ سیتاپور میں آنکھ کے آپریشن کے سلسلہ میں بغرض علاج حضرت مولانا علی میاں ندوی مقیم تھے۔ وہاں حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کا عیادت کا خط انہیں پہنچا وہ اس کے احترام میں اٹھ کر بیٹھ گئے، اور نہایت مسرت کا اظہار کیا، اسی طرح کا ایک واقعہ ہے راقم موجود تھا کہ حضرت مولانا علی میاں نے حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کی خدمت میں ایک گرم جانماز بھیجی، حضرت مولانا نے اس کو بسر و چشم قبول کیا سینہ پر رکھا، آنکھ سے لگایا سر پر رکھا، اور پھر خادم سے فرمایا کہ اس کو ہمارے سامان میں رکھ دو، اور کلمات شکر ادا کیے، دونوں ایک دوسرے کا کیسا پاس و لحاظ کرتے تھے اس کا بھی ایک واقعہ ملاقات کا قابل ذکر ہے۔ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب عندالملاقات معانقہ میں دونوں ملنے والوں کو داہنی طرف سے عمل کرنے پر زور دیتے تھے، تاکہ صحیح طور پر سنت کی ادائیگی ہو، یہ دونوں بزرگ معانقہ کے لئے بڑھے دائیں کی تلاش میں دونوں کا چہرہ بار بار سامنے ہو کر مل رہا تھا اور گردن نہیں مل پا رہی تھی پھر بھی دونوں میں کسی نے یہ نہیں کہا کہ ادھر سے کریں کہ کہیں دوسرے کو خفت اٹھانی نہ پڑے، آخر پھر یہ دونوں حضرات بیٹھ گئے، اور دونوں ایک دوسرے کے مقام و مرتبہ کا پورا لحاظ کرتے رہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندوی کی وفات کے بعد یہ تعلق شفقت کے انداز میں ان کے اخلاف کے ساتھ ہو گیا تھا گویا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین وافراد خاندان کو انہوں نے اپنی سر پرستی میں لے لیا تھا ، اور اسی طرح حضرت مولانا ابرارالحق صاحب کے افراد خاندان واہل مدرسہ کا تعلق حضرت مولانا علی میاں کے افراد خاندان اوران کے ادارے ندوۃ العلماء کے ساتھ بڑھتا گیا، چنانچہ آج حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب (داماد وجانشین حضرت مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ) اورحضرت قاری امیر حسن صاحب (صدر مدرس مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی وخلیفہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی) کا تعلق حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء وجانشین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء وخواہرزادہ مولانا سید ابوالحسن علی) کے ساتھ اسی محبت وتعلق کا امتداد ہے جوان دو بزرگوں کے درمیان تھا۔